الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

فساد صرف حکیمانہ تدبیروں سے ختم ہوتا ہے
نہ کہ فساد ختم کرو کا مطالبہ کرنے سے ۔

مارچ ۱۹۸۸ شمارہ ۱۳۶

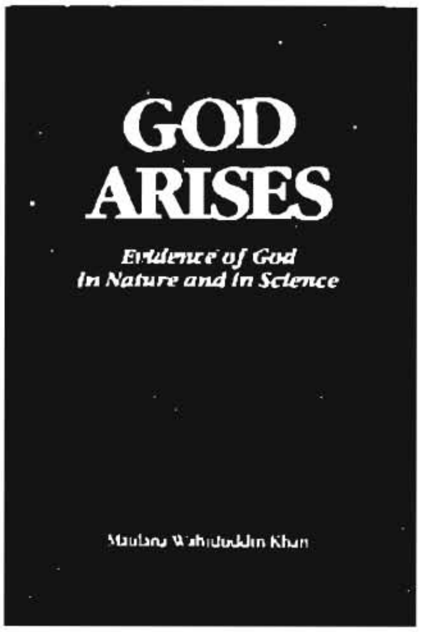

God Arises

By Maulana Wahiduddin Khan

This is a translation with some additions of the famous Urdu book of Maulana Wahiduddin Khan, *Mazhab Aur Jadeed Challenge*, translated into Arabic as *Al-Islam Yatahaddah*, which became a best-seller throughout the Arab world. It has also been translated into a number of other languages including Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), French, Sindhi, Tamil etc., and has come to be accepted as a standard work on the Islamic position vis-à-vis modern thought.

A Review

"... in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind".

— *Daily AL-AHRAM (Cairo)*

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 (Pbk) 81-85063-17-6 (Hbd) Price Rs. 45

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۶ مارچ ۱۹۸۸

فہرست

	صفحہ		صفحہ
یہ انسان	۲	زاویہ نظر کی غلطی	۱۰
ماضی اور حال کا فرق	۳	ایمانی کردار	۱۱
دو قسم کے لوگ	۴	اعتراف اور بے اعترافی	۱۲
ایک شہادت	۵	اللہ اکبر	۱۳
اعلان، اقدام	۶	وہ نہیں دیکھتے	۱۴
دشمن میں دوست	۷	حکمت اور صبر	۱۵
ترقی کا راز	۸	چرچل کا اقرار	۱۶
ایک مثال	۹	ایک سفر	۱۷

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

یہ انسان

قرآن میں ارشاد ہوا ہے : " زمین و آسمان میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے لوگ گزرتے رہتے ہیں۔ مگر ان پر وہ دھیان نہیں دیتے " (یوسف ۱۰۵) جو بات ہم انسانی زبان میں کہنا چاہتے ہیں، وہ کائنات میں زیادہ بہتر طور پر خدائی زبان میں نشر ہو رہی ہے۔ پھر خدا کی آواز کو سننے کے لیے جب لوگوں کے کان بہرے ہوں تو انسان کی آواز سے وہ کیا اثر قبول کریں گے۔ جو لوگ خدا کی تحریر کو نہ پڑھ سکیں وہ انسان کی تحریر کو پڑھ کر کیا پائیں گے۔

کائنات کی وسعتوں اور عظمتوں سے زیادہ کون اس بات کا سبق دے سکتا ہے کہ انسان انتہائی طور پر ایک حقیر وجود ہے۔ عجز کے سوا کوئی اور رویہ اس کے لیے درست نہیں۔ اس کے باوجود انسان گھمنڈ کرتا ہے (اسراء ۔ ۳۷)

پہاڑوں کے پتھریلے سینے سے بہہ نکلنے والے پانی کے دھارے سے بڑھ کر کون اس حقیقت کو بیان کر سکتا ہے کہ تم دوسروں کے لیے سیرابی اور تراوٹ کے دریا بن جاؤ۔ مگر انسان دوسروں کے لیے پتھر سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوتا ہے (بقرہ ۔ ۷۴)

زمین کے سینے پر کھڑے ہوئے تناور درختوں سے زیادہ بہتر طور پر کون اس حقیقت کا اعلان کر سکتا ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرو تاکہ کوئی اس کو اکھاڑ نہ سکے۔ اس کے باوجود لوگ وقتی جھاڑ جھنکاڑ کی مانند اپنی تعمیرات کھڑی کرتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ فلاں نے میرے درخت کو اکھاڑ لیا (ابراہیم ۔ ۲۶)

اگر لوگوں کے پاس سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ ہو تو کائنات ہر آن خدائی سچائیوں کا اعلان کر رہی ہے۔ اور جب خدائی اعلان کو سننے کے لیے لوگوں کے کان بہرے ہو جائیں۔ اور خدائی نشانیوں کو دیکھنے کے لیے لوگوں کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہوں تو کوئی انسانی آواز انھیں کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اس کے بعد تو لوگوں کو ہوش میں لانے کے لیے قیامت کی چنگھاڑ ہی کا انتظار کرنا چاہیے۔

ماضی اور حال کا فرق

پروفیسر ہولٹ (P.M. Holt) اور دوسرے مستشرقین نے اسلامی تاریخ پر ایک کتاب تیار کی ہے جو حسب ذیل نام سے چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے :

The Cambridge History of Islam

اس کتاب کی جلد ۲۔ بی کے ایک باب میں تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ ماضی میں ا نے مغربی دنیا کے علوم اور تہذیب پر نہایت گہرے اثرات ڈالے۔ اس کا عنوان ہے :

Literary impact of Islam on the modern West

اس باب کے آخر میں مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ قرون وسطی کے دوران علم کا بہاؤ تقریباً تمام تر مشرق سے مغرب کی طرف تھا، جب کہ اسلام مغرب کا معلّم بنا ہوا تھا، اب موجودہ زمانہ میں صورتحال اس کے برعکس ہے، اب یہ بہاؤ مغرب سے مشرق کی طرف جاری ہے :

Whereas during the Middle Ages the trend was almost entirely from East to West (when Islam acted as the teacher of the West), in modern times the direction of influence has been reversed (pp. 888 - 89).

ماضی میں مسلمان دنیا کے معلّم تھے، موجودہ زمانہ میں وہ دنیا کے شاگرد بن گیے۔ ا فرق میں اس سوال کا جواب چھپا ہوا ہے کہ مسلمان ماضی میں قوموں کے درمیان باعزت کیوں اور حال میں وہ قوموں کے درمیان بے عزت کیوں ہو گیے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان ساری دنیا میں صرف ایک کام کر رہے ہیں۔ وہ اپنی محرومی پر ا کرنے میں مشغول ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا کے قانون کو موجودہ زمانہ بدل دیا ہے۔ پچھلے زمانہ میں اگر یہ قانون تھا کہ دینے والا پائے، تو اب یہ قانون ہے کہ ا اور مطالبہ کرنے والوں کو دیا جائے۔

اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا کے قانون کو نہیں بدلا ہے تو مسلمانوں کا موجودہ مشغلہ صرف ان بربادی میں اضافہ کرنے والا ثابت ہو گا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

دو قسم کے لوگ

جسم کے اوپر کیچڑ لگ جائے تو اس کو پانی سے دھویا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر جسم کے اندر کوئی اخلی خرابی پیدا ہو جائے تو اس کو دھو کر صاف کرنا ممکن نہیں۔ یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ اگر دمی اوپری طور پر کسی دینی خرابی میں مبتلا ہو تو اس کے متعلق امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے درگذر مائے گا۔ مگر جن کے گناہوں نے جسم سے لے کر روح تک ان کا احاطہ کر لیا ہو، ان کے لیے اللہ تعالیٰ یہاں معافی نہیں۔

ایک برائی وہ ہے کہ جب آدمی اس کو کرے تو اس کا دل اس کا ساتھ نہ دے۔ اس کو یہ حساس ستاتا رہے کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ اپنے اس فعل کی بنا پر اس کو خود اپنے آپ سے نفرت ہو جائے۔ وہ شرمندہ ہو کر معافی چاہے اور شیطان سے پناہ مانگتا ہوا اللہ کی طرف دوڑ پڑے۔ ایسے دمی کی اندرونی حالت اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ اس کا گناہ اوپری گناہ تھا۔ وہ اس کی روح کا ہ نہ تھا۔ اس کی برائی کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے جسم کا اندرونی نظام تو صحت مند تھا۔ البتہ اس کے سم کے اوپر کسی وجہ سے گندگی لگ گئی۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے تزکیہ کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو پاک مائے گا۔ اور آخرت میں ان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ جنت کی پاکیزہ دنیا میں آباد ہو سکیں۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جن کی برائی ان کے اندر تک داخل ہو گئی ہو۔ ان کے اعضاء جو کچھ کریں ہ ان کے دل و دماغ کا سوچا سمجھا منصوبہ ہو۔ ان کا فعل محض وقتی جذبہ کے تحت صادر نہ ہوا ہو بلکہ کے پیچھے حسد، بغض، کبر، انتقام، اور سرکشی جیسے اندرونی جذبات کام کر رہے ہوں۔ ان کے ظاہری میں ان کے اندرونی احساسات پوری طرح شریک ہوں۔ ایسے لوگوں کی خرابی اوپری خرابی نہیں، ان کی شخصیت میں آخری گہرائی تک اتری ہوئی ہے۔ اس قسم کے لوگ تزکیۂ خداوندی سے محروم ہیں گے، وہ آخرت میں جہنم کے مستحق قرار پائیں گے۔

پہلی قسم کے لوگ دنیا ہی میں اپنا حساب آپ کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ آخرت کے حساب سے جائیں گے۔ دوسری قسم کے لوگ دنیا میں اپنے حساب سے غافل ہوتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو خرت میں پکڑے جائیں گے۔ اور جو شخص آخرت میں پکڑا جائے اس کے لیے نجات کی کوئی صورت نہیں۔

ایک شہادت

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم پر جو مقالہ ہے، اس کے میں مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ بہت کم بڑے لوگ اتنا زیادہ بدنام کیے گیے ہیں جتنا کہ محمد کو بدنام کیا گیا قرون وسطی کے یورپ کے مسیحی علمار نے ان کو فریبی اور عیاشں اور خونی انسان کے روپ میں پیش حتی کہ آپ کے نام کا ایک بگڑا ہوا تلفظ مہاونڈ (نعوذ باللہ) شیطان کے ہم معنی بن گیا۔ محمد اور ان مذہب کی یہ تصویر اب بھی کسی قدر اپنا اثر رکھتی ہے۔ انگریز مصنف ٹامس کارلائل پہلا قابل مغربی شخص تھا جس نے ۱۸۴۰ میں بتاکید عوامی طور پر کہا کہ محمد یقیناً سنجیدہ تھے کیوں کہ یہ فرض بالکل مضحکہ خیز ہے کہ ایک فریبی آدمی ایک عظیم مذہب کا بانی ہو سکتا ہے:

Few great men have been so maligned as Muhammad. Christian scholars of medieval Europe painted him as an impostor, a lecher, and a man of blood. A corruption of his name, 'Mahound, even came to signify the devil. This picture of Muhammad and his religion still retains some influence. The English author Thomas Carlyle in 1840 was the first notable European to insist publicly that Muhammad must have been sincere, because it was ridiculous to suppose an impostor would have been the founder of a great religion (12/609).

مغربی پروپیگنڈے کی تردید کے لیے ٹامس کارلائل نے یہاں جو دلیل استعمال کی ہے، کسی شخصیت کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے سب سے زیادہ درست اور یقینی ہے۔ در اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح انسان اپنے کردار سے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کا کلام پڑھے، جو یہ دیکھے کہ روز وشب آپ کن سرگرمیوں میں مصروف تھے اور یہ کہ آپ کے اثر سے کس قسم کی تحریک برپا ہوئی، وہ ہرگز یقین نہیں کر سکتا کہ یہ سب ایک فریبی انسان کا کارنامہ ہے۔

ایک شخص جس کے کلام میں تعبیر انسانیت کی باتیں ہوں، جس کا لہجہ درد اور سوز سے ہو، جس کے مشن سے لوگوں کی زندگیوں میں صالح انقلاب آرہا ہو، وہ کبھی فریبی انسان نہیں ہو فریبی انسان ایک فریبی تحریک اٹھا سکتا ہے نہ کہ ایک صالح ربانی تحریک۔

اعلان، اقدام

حق کا اعلان ہر حال میں مطلوب ہے، خواہ سننے والا اس کو سنے یا نہ سنے، خواہ مخاطب اس کو مانے یا نہ مانے۔ مگر حق کے لیے عملی اقدام کا معاملہ سراسر مختلف ہے۔ وہ نتیجہ کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر نتیجہ نکلنے کا یقینی امکان ہو تو اقدام کیا جائے گا۔ ورنہ اقدام سے باز رہ کر صرف صبر کیا جاتا رہے گا۔

اعلان اور اقدام کا یہ فرق قرآن و سنت میں واضح طور پر ملتا ہے۔ مثلاً قرآن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ لوگوں کو حق بات کی یاد دہانی کراؤ۔ تم صرف یاد دہانی کرنے والے ہو۔ تم لوگوں کے اوپر داروغہ نہیں ہو۔ (الغاشیہ) یعنی نتیجہ نکلے یا نہ نکلے، ہر حال میں تبلیغ حق کا کرتے رہو۔ تمہارا کام پہنچا دینا ہے، نتیجہ نکالنا تمہارے ذمہ نہیں۔ یہ وہ بات ہے جو تبلیغ بارہ میں کہی گئی۔

دوسری طرف روایات میں آتا ہے کہ مکہ کے زمانے میں حضرت ابوبکر نے عملی اقدام کی بات تو آپ نے فرمایا: یا ابابکر انا قلیل (اے ابوبکر ہم تھوڑے ہیں) اسی طرح حضرت عمرؓ نے عملی اقدام کے لیے کہا تو آپ نے دوبارہ فرمایا: یا عمر انا قلیل (اے عمر ہم تھوڑے ہیں) ابن کثیر، جلد اول۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ قلت تعداد اور قلت وسائل کی وجہ سے ابھی ہم اس حالت میں نہیں ہیں کہ فریق ثانی کے خلاف اقدام کر کے کوئی واقعی نتیجہ برآمد کر سکیں۔ اس لیے ابھی ہم کوئی عملی اقدام نہیں کریں گے۔ ابھی ہم پیغام رسانی پر قانع رہ کر بقیہ امور میں صبر کی روش پر قائم رہیں گے۔

بولنے سے پہلے سوچنا ضروری ہے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ آدمی کرنے سے پہلے کرنے کی تیاری۔ جو شخص سوچے بغیر بولے وہ فضول گوئی کا مرتکب ہوگا۔ اسی طرح جو شخص ضروری تیاری کے اقدام کرے، اس کا اقدام نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ ایسا اقدام ایک قسم کی خودکشی ہے۔ وہ موت چھلانگ ہے نہ کہ زندگی کی طرف سفر۔

دشمن میں دوست

ڈاکٹر سید عبداللطیف (۱۸۹۱ - ۱۹۷۱) کرنول (دکن) میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن اور دوسری خدمات کی وجہ سے کافی مشہور ہیں۔ وہ مقامی ہائی اسکول میں اپنے والد کی اطلاع کے بغیر داخل ہوگیے تھے۔ والد کو انگریز اور انگریزی تعلیم سے سخت نفرت تھی۔ ان کو معلوم ہوا تو غصہ ہوگیے اور درشت لہجے میں پوچھا کہ انگریزی پڑھ کر کیا کرے گا۔ دبلے پتلے، پست قامت لڑکے نے جواب دیا: انگریزی پڑھ کر قرآن کا ترجمہ انگریزی زبان میں کروں گا۔ ۱۹۱۵ میں انھوں نے بی اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۲۰ میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۲ میں ان کے لیے نیا تعلیمی موقع پیدا ہوا جب کہ جامعہ عثمانیہ کے چار استادوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ بھیجنا طے پایا اور ان کے لیے ریاست کی طرف سے ۳۰ ہزار روپے کا بلاسودی قرض منظور کیا گیا۔ ان میں سے ایک سید عبداللطیف بھی تھے۔

لندن پہنچ کر وہ وہاں بی اے (آنرز) میں داخلہ لینا چاہتے تھے۔ مگر کنگس کالج کے صدر شعبۂ انگریزی اور دوسرے انگریز اساتذہ آپ کی صلاحیت سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ آپ کو بی اے اور ایم اے سے مستثنیٰ کرتے ہوئے براہ راست پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت دے دی۔ آپ کے مقالہ کا عنوان "اردو ادب پر انگریزی ادب کے اثرات" طے پایا۔ مقالہ کی تیاری کی مدت تین سال مقرر کی گئی تھی مگر آپ نے دو سال ہی میں پی ایچ ڈی کے مقالہ کی تکمیل کر لی۔ کنگس کالج کے ذمہ داروں نے اس کو منظور کرتے ہوئے ڈاکٹریٹ کا مستحق قرار دیا۔ سید عبداللطیف مقررہ مدت سے ایک سال پہلے ڈاکٹر ہو کر حیدرآباد واپس آگیے۔ یہاں آپ کو فوراً جامعہ عثمانیہ کا پروفیسر بنا دیا گیا۔ (انجمن، از حسن الدین احمد آئی اے ایس)

۱۹۲۲ میں انگریز کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ مگر اسی دشمن نے مسلمان طالب علم کے ساتھ فیاضی کا وہ معاملہ کیا جس کی مثال مسلم اداروں میں بھی مشکل سے ملے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ "دشمن انسان" کے اندر بھی "دوست انسان" موجود ہوتا ہے۔ مگر اس دوست انسان کو وہی لوگ پاتے ہیں جو دوستی اور دشمنی سے اوپر اٹھ کر انسانوں سے معاملہ کرنا جانتے ہوں۔

ترقی کا راز

جاپان کے بارہ میں ایک امریکی مصنف کی ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے: جاپان نمبر ایک کی حیثیت سے۔ ڈھائی سو صفحہ کی اس کتاب میں مصنف نے دکھایا ہے کہ جاپان کس طرح دوسری جنگ عظیم میں مکمل شکست سے دوچار ہونے کے بعد دوبارہ اس طرح کھڑا ہو گیا کہ خود اپنے فاتح (امریکہ) کے لیے چیلنج بن گیا۔ مصنف کے الفاظ میں، جاپانی لوگ تبدیلی کے آقا بن گیے، بجائے اس کے کہ وہ اس کا شکار ہو جائیں۔ دوسرے ممالک کو بیرونی اثرات نے برباد کر دیا مگر جاپان نے اس سے طاقت پائی:

> Thus they became the masters of change rather than the victims. Other countries were devastated by foreign influence, but Japan was invigorated.
>
> Ezra F. Vogel, *Japan As Number One,*
> Harward University Press, London 1979, p. 256.

مصنف کے نزدیک جاپان کی اس غیر معمولی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس نے فوجی اور سیاسی میدان میں شکست کھانے کے بعد اپنے میدانِ عمل کو بدل دیا اور اپنی ساری توجہ علم کی راہ میں لگا دی۔ اس کتاب کے تیسرے باب میں مصنف نے بتایا ہے کہ جاپان کی موجودہ کامیابی کا واحد عامل (Single factor) اگر کسی چیز کو قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے جاپانی قوم میں علم (Knowledge) کی تلاش کا لامتناہی جذبہ۔ اس سلسلہ میں مصنف نے لکھا ہے:

> When a foreign visitor comes to Japan, most Japanese almost instinctively think, "What can I learn from him?" And the three million Japanese who now travel abroad each year look for little hints of new ideas they might apply at home (p. 29).

جب باہر کا کوئی آدمی جاپان آتا ہے تو اکثر جاپانی تقریباً جبلی طور پر سوچتے ہیں: "میں اس سے کیا بات سیکھ سکتا ہوں" اور تین ملین جاپانی جو آج کل ہر سال باہر کی دنیا کا سفر کرتے ہیں وہ جب باہر پہنچتے ہیں تو وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ انھیں کوئی نیا تصور ہاتھ آ جائے جس کو واپس جا کر وہ اپنے ملک میں استعمال کر سکیں۔

ایک مثال

ڈاکٹر ایم خلیل اللہ امراض قلب کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ اس وقت نئی دہلی کے گوبند بلبھ اسپتال میں ڈائرکٹر ہیں۔ انھوں نے اندرون ملک ہندستان کا پہلا پیس میکر (Pacemaker) تیار کیا ہے۔ یہ وہ طبی آلہ ہے جو دل کی حرکت کو مصنوعی طور پر باقاعدہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جب کہ اس کا قدرتی نظام کام نہ کر رہا ہو۔ ان کی اس قسم کی ممتاز طبی خدمات کی بنا پر ناگپور یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری عطا کی ہے۔

ڈاکٹر خلیل اللہ کو یہ اعزاز ناگپور یونیورسٹی کے ۷۵ ویں کنونشن پر وائس چانسلر ڈاکٹر مدھو سودن چن سرکار نے ۵ جنوری ۱۹۸۸ کو پیش کیا۔ کنونشن کے مہمان خصوصی لوک سبھا کے اسپیکر مسٹر بلرام جاکھڑ تھے۔

ڈاکٹر خلیل اللہ نے ایک جدید برقی لیبارٹری قائم کر کے امراض قلب کی تشخیص میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کو ۱۹۸۴ میں پدم شری کا ایوارڈ دیا گیا تھا۔ اسی سال انھیں بی سی رائے قومی ایوارڈ بھی ملا۔ ڈاکٹر خلیل اللہ نے کئی نصابی کتابوں کی تیاری میں حصہ لیا ہے اور قومی اور بین اقوامی طبی جرنل میں ان کے ۱۲۰ مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ (قومی آواز ۶ جنوری ۱۹۸۸)

"ایم خلیل اللہ" اگر ڈاکٹر کی ڈگری لینے کے لیے مطالبات کی مہم چلاتے۔ وہ جلسوں اور تقریروں کے ذریعہ یہ مانگ کرتے کہ مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دو تو کوئی یونیورسٹی ان کی طرف توجہ نہ کرتی۔ مگر جب انھوں نے ممتاز کام کر کے اپنے آپ کو ڈگری کا مستحق ثابت کر دیا تو مانگ کے بغیر ان کو ڈگری مل گئی۔ آدمی اگر واقعی معنوں میں کوئی قابل قدر کام کرے تو وہ قدر دانی پا کر رہتا ہے، خواہ وہ ایک فرقہ کا آدمی ہو یا دوسرے فرقہ کا۔

موجودہ دنیا کا نظام نفع بخشی کے اصول پر قائم ہے۔ یہاں سب سے زیادہ بے قیمت چیز مانگنا ہے اور سب سے زیادہ باقیمت چیز دینا۔ مانگنے والا اپنے گھر کے اندر بھی حقیر ہو جاتا ہے اور اپنے گھر کے باہر بھی۔ مگر جو شخص اپنے آپ کو دینے والا بنالے وہ اپنوں کے اندر بھی عزت پائے گا اور اپنوں کے باہر بھی۔

زاویہ نظر کی غلطی

منشی پریم چند (۱۹۳۶-۱۸۸۰) کو ناول نگاری میں اگرچہ غیر معمولی مقام ملا مگر وہ نہایت سادہ مزاج کے آدمی تھے۔ اور شہرت سے بہت دور رہنا چاہتے تھے۔ ان کے ایک دوست مسٹر جے نند کمار لکھتے ہیں کہ پریم چند کو میں نے پایا کہ وہ بڑے بننے کے پیچھے نہیں ہیں، سچا بننا ان کا مقصد ہے۔ میں نے انھیں بار بار دیکھا ہے وہ دھوم دھام کے آدمی نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ کسی اور گہری سچائی کے خواہاں رہتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہم نے ایک لٹریری کانفرنس میں صدر بنا کر پریم چند کو دہلی بلایا۔ لیکن وہ آنے کو راضی ہی نہ ہوتے تھے۔ خط لکھا، تار دیئے، لیکن انھوں نے لکھا، تم ذاتی طور پر بلاؤ تو آجاؤں لیکن کانفرنس کی تہمت کیوں دیتے ہو۔ آخر رضامندی دی بھی تو تار میں لکھا:

Reaching the protest

مسٹر جے نند کمار لکھتے ہیں کہ ایک بات پر اکثر ان کے ساتھ میری بات چیت ہوئی اور وہ ہے ایشور اور دھرم۔ وہ ایشور کے وجود کے قائل نہیں تھے۔ کیوں کہ وہ دیکھتے تھے کہ ایشور اور دھرم اچھے سے زیادہ برے کام میں لائے جاتے تھے۔ وہ پوچھتے، دنیا میں زور ہے، ظلم ہے، لوگ ستائے جاتے ہیں اور بھوکوں مرتے ہیں۔ چاروں طرف دکھ کی چیخ پکار ہے، تم اس ایشور کو مانوگے جو اس سب کی اجازت دیتا ہے۔ وہ مصیبت زدوں کی حالت دیکھ کر خدا کے منکر ہو جاتے تھے (کیا خوب آدمی تھا)

منشی پریم چند نہایت نیک مزاج آدمی تھے مگر دنیا کے حالات کو انھوں نے صحیح رخ سے نہ دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حالات کی معنویت کو سمجھ نہ سکے اور خدا کے منکر ہوگیے۔ موجودہ دنیا کو سمجھنے کا راز یہ ہے کہ اس کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ وہ "دار الامتحان" ہے۔ یہی موجودہ دنیا کو دیکھنے کا صحیح زاویہ ہے اور کسی چیز کا مطالعہ اسی وقت صحیح ہوتا ہے جب کہ اس کو صحیح زاویہ سے دیکھا جائے۔

موجودہ دنیا کو آخرت سے الگ کرکے دیکھا جائے تو مذکورہ نقطۂ نظر درست نظر آئے گا۔ لیکن اس کو آخرت سے ملا کر دیکھیے تو موجودہ خرابیاں معقول معلوم ہونے لگتی ہیں۔ کیوں کہ دار الامتحان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کو عمل کی آزادی ہو۔ اور جب تمام لوگوں کو آزادی ہوگی تو کوئی صحیح کرے گا اور کوئی غلط، اور پھر وہی صورت حال پیش آئے گی جو موجودہ حالت میں، دنیا میں دکھائی دے رہی ہے۔

ایمانی کردار

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ کی بات ہے۔ لوگ نماز کے لیے مسجد میں اکٹھا تھے۔ جماعت کا وقت ہو گیا مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بیماری کی شدت کی وجہ سے حجرہ سے باہر تشریف نہ لا سکے۔ اس وقت حضرت ابو بکر بھی مسجد میں موجود نہ تھے۔ چنانچہ عبد اللہ بن زمعہ اور دوسرے لوگوں نے اصرار کر کے حضرت عمر کو امامت کے لیے آگے کر دیا۔

حضرت عمرؓ نہایت بلند آواز تھے۔ جب انھوں نے "اللہ اکبر" کہہ کر نماز شروع کی تو ان کی آواز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حجرہ تک پہنچ گئی۔ آپ نے سن کر فرمایا: ابو بکر کہاں ہیں۔ اللہ اور مسلمان اس پر راضی نہیں، (این ابوبکر، یابی اللّٰہ ذالک والمسلمون) اس کے بعد آپ کی ہدایت کے مطابق حضرت ابو بکر بلائے گئے، اور حضرت عمر کے بجائے انھوں نے نماز پڑھائی۔

جس وقت یہ واقعہ ہوا، اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کے حجرہ میں تھے۔ چونکہ اسی امامتِ نماز پر آئندہ خلافتِ حکومت کا فیصلہ ہونے والا تھا، اس لیے حضرت عمر یہ سوچ سکتے تھے کہ ان کو خدانخواستہ کسی "سازش" کے تحت امامت کے مقام سے ہٹایا گیا ہے، اور اس سازش کا اصل دماغ عائشہ ہیں جو حضرت ابو بکر کی صاحبزادی ہیں۔ انھوں نے اپنے والد کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ بنانے کے لیے یہ ڈرامہ کروایا ہے۔

مگر حضرت عمر کا خوفِ خدا اس میں مانع تھا کہ وہ اس قسم کی بدگمانی کو اپنے دل میں جگہ دیں۔ راوی کہتے ہیں کہ عمر نے ابو بکر پر کسی قسم کا الزام نہیں لگایا (کان عمر غیر مُتَّھِمٍ علیٰ ابی بکر، سیرۃ النبی لابن ہشام، الجزء الرابع، صفحہ ۳۳۲)

کسی گروہ کو متحد رکھنے اور اس کی اجتماعی زندگی کو مستحکم بنیاد پر قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے افراد کے اندر ایک دوسرے کے بارہ میں حسنِ ظن پایا جاتا ہو۔ مضبوط اجتماعیت کے لیے حسنِ ظن اتنا ہی ضروری ہے جتنا مضبوط تعمیر کے لیے سمنٹ۔ دور اول کے مسلمان اپنی اسی خصوصیت کی بنیاد پر کامل اتحاد کا نمونہ تھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اس خصوصیت کو کھو دیا ہے، اسی لیے وہ اجتماعیت اور اتحاد کو بھی کھوئے ہوئے ہیں۔

اعتراف اور بے اعترافی

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں ۔ ایک وہ جن کے اندر اعتراف کا مادہ نہ ہو۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کے سامنے حق واضح ہو کر آئے تو وہ اس کا اعتراف کرے ۔ قرآن میں دونوں قسم کے انسان کی مثالیں دی گئی ہیں ۔

ایک انسانی کردار وہ ہے جس کا ذکر سورہ مریم میں کیا گیا ہے ۔ حضرت مریم نہایت پاکباز خاتون تھیں ۔ وہ فلسطین کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئیں ۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ خاص کے تحت ان کے یہاں بغیر باپ کے ایک لڑکا پیدا ہوا ۔ یہ ایک پاکدامن خاتون کے لیے بڑی سخت آزمائش تھی ، تاہم فرشتہ کی ہدایت پر وہ گود کے بچہ کو لے کر شہر میں آئیں ۔ یہود نے جب ایک غیر شادی شدہ خاتون کو اس حال میں دیکھا کہ وہ ایک چھوٹا بچہ گود میں لیے ہوئے ہے تو انھوں نے کہا : اے مریم ، تونے غضب کر دیا ۔ اے ہارون کی بہن ، تیرا باپ برا آدمی نہ تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھی ۔ پھر یہ حرکت تجھ سے کیوں کر سرزد ہوئی ۔

حضرت مریم خود کچھ نہیں بولیں ۔ فرشتہ کی ہدایت کے مطابق انھوں نے بچہ کی طرف اشارہ کر دیا ۔ یہود نے کہا کہ ایک چھوٹے بچہ سے ہم کس طرح بات کریں ۔ عین اس وقت حیرت انگیز طور پر گود کا بچہ بول اٹھا ۔ اس نے نہایت فصیح زبان میں کہا کہ میں اللہ کا بندہ (مسیح) ہوں ۔ اللہ نے مجھ کو کتاب دی ہے اور اس نے مجھ کو پیغمبر بنایا ہے ۔

ایک چھوٹے بچہ کا اس طرح کلام کرنا انتہائی طور پر غیر معمولی تھا ۔ اس طرح معجزاتی سطح پر یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت مریم بدکار خاتون نہیں ہیں ۔ حضرت مریم کی پاکبازی کا اس سے بڑا ثبوت کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ گود کا بچہ کلام کر کے آپ کی پاکبازی کا اعلان کرے ۔ مگر اس کے باوجود یہود نے حضرت مریم کو پاکباز تسلیم نہیں کیا ۔ ان کی گود میں چھوٹا بچہ دیکھ کر ان کے خلاف الزام لگانے میں تو انھوں نے بہت تیزی دکھائی ۔ مگر معاملہ کی وضاحت کے بعد وہ اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے ۔

جو لوگ اس روش کا ثبوت دیں ان کو کبھی حق کی ہدایت نہیں ملتی ۔ حق کے داخلہ کا واحد دروازہ اعتراف ہے ، اور مذکورہ قسم کے لوگوں کے یہاں یہ دروازہ موجود ہی نہیں ۔

اللہ اکبر

اس کائنات کی اہم ترین حقیقت یہ ہے کہ اس کا ایک خالق ہے ، اور یہ خالق سب سے بڑا ہے۔ اس سے بڑا اور کوئی نہیں۔ اذان اور نماز میں بار بار اللہ اکبر کہنا اسی سب سے بڑی سچائی کا مسلسل اعلان ہے۔ اذان اور نماز کے ذریعہ گویا ہم کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔

سب سے بڑی حقیقت کا اعتراف کوئی معمولی چیز نہیں۔ یہ خود اپنے آپ کو سب سے بڑے مقام کا مستحق بنانے کے ہم معنی ہے۔ مغرب نے اس کا اعتراف کیا کہ کائنات سب سے بڑی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کو تمام قوموں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ بڑی حیثیت حاصل ہوگئی۔ پھر جو لوگ کائنات کے خالق کی بڑائی کو پالیں، ان کا حال کتنا عظیم ہونا چاہیے۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان ہر جگہ کمزور اور مغلوب ہیں۔ ہمارے حق میں "اللہ اکبر" کی وہ برکتیں ظاہر نہیں ہوتیں جو مغرب کے حق میں "الکون اکبر" کہنے کے نتیجہ میں ظاہر ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اللہ اکبر کے الفاظ کو پایا۔ مگر ہم نے اس کی حقیقت کو نہیں پایا۔ ہم اللہ اکبر کے الفاظ فضا میں بکھیرتے ہیں۔ مگر خود اپنے اندر اسے داخل نہیں کرتے۔

میں نے ایک عربی اخبار میں ایک مضمون پڑھا۔ اس کا عنوان تھا : اللہ اکبر فی سماء لندن (لندن کی فضا میں اللہ اکبر کی آواز) یہ لندن کی جامع مسجد کا تعارف تھا۔ مضمون کے ساتھ لندن کی نو تعمیر عظیم مسجد کی تصویر تھی اور دکھایا گیا تھا کہ یہاں سے ہر روز پانچ وقت "اللہ اکبر" کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر بلند کی جاتی ہے جو لندن کی فضاؤں میں گونجتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لاؤڈ اسپیکر کی ایجاد نے ہمیں یہ موقع دیا ہے کہ ہم آسمان تک اللہ اکبر کی آواز کو پہنچا دیں، مگر خود اپنے سینہ کے اندر ہم اللہ اکبر کی آواز کو نہ پہنچا سکے۔ آلۂ مکبر الصوت کے ذریعہ ہم نے بلند فضاؤں میں اللہ اکبر کا ارتعاش پیدا کر دیا۔ مگر اس واقعہ کو ریکارڈ کرنے کے لیے ابھی خدا کے فرشتے انتظار کر رہے ہیں جب کہ خدا کی کبریائی کا احساس ہمارے دلوں میں ارتعاش پیدا کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ اکبر کی برکتوں میں سے کوئی برکت ابھی تک ہمارے حق میں ظاہر نہیں ہوئی۔

وہ نہیں دیکھتے

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ۔

(الاعراف ۱۹۸)

اور (اے پیغمبر) اگر تم ان (مشرکین) کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ نہیں سنیں گے۔ اور تم کو نظر آتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں، اور وہ (تم کو) نہیں دیکھتے۔

اس آیت میں ضمیر غائب اہل کفر و شرک کی طرف راجع ہے اور ضمیر مخاطب کا رخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ حضرت حسن نے آیت کی تشریح اسی کے مطابق کی ہے:

قال الحسن معنى الآية إن تدعوهم يعني المشركين الى الاسلام لا يسمعوا اي لا يعقلون ذالك بقلوبهم وتراهم ينظرون اليك باعينهم وهم لا يبصرون بقلوبهم

(التفسیر المظہری، المجلد الثالث، صفحہ ۴۴۵)

حسن نے کہا، آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم مشرکین کو اسلام کی طرف بلاؤ تو وہ نہیں سنیں گے۔ یعنی وہ اس کو دل سے نہیں سمجھتے۔ تم دیکھتے ہو کہ وہ اپنی آنکھوں سے تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر وہ اپنے قلوب سے نہیں دیکھتے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ کے لوگوں کے لیے بظاہر انسانوں میں سے ایک انسان تھے۔ اس وقت آپ کے نام کے ساتھ وہ تاریخی عظمتیں جمع نہیں ہوئی تھیں جو آج جمع ہو چکی ہیں اور جن کی وجہ سے آج ہر آدمی آپ کا احترام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس وقت آپ کو پہچاننے کے لیے اندرونی جوہر کو دیکھنے والی نگاہ درکار تھی۔ چنانچہ جن لوگوں کے پاس یہ نگاہ تھی انھوں نے اسی وقت آپ کو پہچان لیا اور آپ کے ساتھی بن گیے، مگر جو لوگ اس قسم کی نگاہ سے محروم تھے وہ آپ کو پہچان نہ سکے اور آپ کے منکر بن گیے۔

ایک ہے ظاہری رونقوں کی بنیاد پر کسی کو جاننا۔ دوسرا ہے، اندرونی جوہر کی بنیاد پر کسی کا قدرداں بننا۔ جو لوگ صرف ظاہری چیزوں کو دیکھ سکتے ہوں وہ ایسے کسی انسان کی قدردانی نہیں کر سکتے جو باطنی حقیقتوں کا خزانہ اپنے اندر لیے ہوئے ہو۔ وہ بظاہر اسے دیکھیں گے مگر وہ اس کو پہچاننے والے نہیں بنیں گے۔

حکمت اور صبر

موجودہ دنیا میں کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے حکمت اور صبر لازمی طور پر ضروری ہیں۔ حکمت اور صبر کے بغیر نہ دین کا کوئی مقصد حاصل کیا جا سکتا اور نہ دنیا کا۔

حکمت کی جڑ یہ ہے کہ آدمی ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو جانے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ہر قسم کے ظلم کے باوجود ظالموں سے نہیں لڑے۔ مگر مدینہ میں حسب ضرورت آپ نے ظالموں کا مقابلہ کیا۔ غزوۂ حمراء الاسد کا سفر بآواز بلند کیا گیا مگر فتح مکہ کے سفر میں آپ نے بلند آوازی سے منع فرمادیا۔ معاہدۂ حدیبیہ کے وقت آپ نے مکہ والوں کی یک طرفہ شرائط پر صلح کر لی۔ مگر بنو بکر اور بنو خزاعہ کا واقعہ پیش آنے کے بعد آپ نے مکہ کے سردار (ابوسفیان) کی تجدید صلح کی پیش کش کو قبول نہیں فرمایا۔ وغیرہ

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کبھی بولنا ضروری ہوتا ہے اور کبھی یہ ضروری ہوتا ہے کہ آدمی اپنے منہ میں زبان رکھتے ہوئے چپ ہو جائے۔ کبھی حالات اقدام کرنے کا تقاضا کرتے ہیں اور کبھی اقدام نہ کرنے کا۔ کبھی آگے بڑھنا افضل ہوتا ہے اور کبھی یہ افضل ہوتا ہے کہ آدمی پیچھے کی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے اپنے آپ کو راضی کرے۔ اسی فرق کو جاننے کا نام حکمت ہے۔

صبر کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی رد عمل سے رکے اور غیر متاثر ذہن کے تحت سوچ سمجھ کر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ آپ سڑک پر اپنی گاڑی دوڑا رہے ہیں اور سامنے اچانک دوسری گاڑی آگئی۔ اب گاڑی کو روک کر اپنے لیے راستہ نکالنے کا نام صبر ہے، اور روکے بغیر گاڑی دوڑانے کا نام بے صبری۔

صبر کا طریقہ موجودہ دنیا میں کوئی حقیقی کامیابی حاصل کرنے کے لیے انتہائی حد تک ضروری ہے۔ جو ڈرائیور بے صبری کے ساتھ سڑک پر گاڑی چلائے وہ خود بھی تباہ ہوگا اور اپنی گاڑی کو بھی تباہ کرے گا۔ اسی طرح جو لوگ صبر کی شرط کو پورا کیے بغیر زندگی میں کامیاب ہونا چاہیں وہ صرف بربادی کی تاریخ بنائیں گے، ترقی اور کامیابی کی تاریخ بنانا ان کے لیے مقدر نہیں۔

چرچل کا اقرار

سرونسٹن چرچل (۱۹۶۵-۱۸۷۴) انگلستان کے انتہائی مشہور سیاست داں تھے۔ وہ ۱۹۴۰ سے ۱۹۴۵ تک برطانیہ کے وزیر اعظم رہے۔ ان کے متعلق مورخین مغرب یہ الفاظ لکھتے ہیں کہ انھوں نے دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کو شکست سے بچاکر فتح تک پہنچایا:

He lead Britain from near defeat to victory in Word War II

چرچل جنگ کے رہنما تھے مگر وہ امن کے رہنما نہ تھے۔ برطانیہ کے لوگوں کا یہ سیاسی شعور قابل داد ہے کہ جنگ عظیم کے فوراً بعد برطانیہ میں عام الکشن ہوا تو انھوں نے اپنے جنگی ہیرو کے حق میں ووٹ نہیں دیا، کیوں کہ جنگ کے بعد برطانیہ کی تعمیر نو کے لیے وہ چرچل کو موزوں نہیں سمجھتے تھے۔

چرچل کے اندر بڑی عجیب وغریب خصوصیات تھیں۔ ان کی ایک خصوصیت کا ذکر مسز وجے لکشمی پنڈت نے اپنی سوانح عمری میں اس طرح کیا ہے:

ہندستان کے مطالبہ آزادی کے جواب میں چرچل نے اعلان کیا تھا کہ وہ سلطنت برطانیہ کے وزیر اعظم اس لیے نہیں بنے ہیں کہ وہ اس کے خاتمہ کی تقریب کی صدارت کریں۔ یہ بات قابل تعجب نہیں ہے کہ ہم لوگ ان سے محبت نہیں کرتے تھے۔ جو چیز قابل تعجب ہے وہ یہ کہ آخر میں جب وہ میرے بھائی (جواہر لال نہرو) سے اس وقت ملے جب کہ عبوری حکومت بن چکی تھی تو دونوں نے ایک دوسرے کو چاہا اور دونوں میں آزادانہ گفتگو ہوئی۔ جب وہ جدا ہوئے تو چرچل نے جواہر لال کو یہ کہہ کر مبارک باد دی کہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے انسان کے دو سب سے بڑے دشمنوں پر فتح پائی ہے۔ وہ ہیں نفرت اور خوف:

He was the man who had announced that he had 'not become His Majesty's first minister to preside over the liquidation of His Majesty's empire'. It was not surprising that we did not love him. What was surprising was that when he finally met by brother after the formation of the interim government, they liked each other and were able to talk freely. When they parted, Sir Winston paid Bhai a handsome tribute: "I want to say that you have conquered two of man's greatest enemies — hate and fear."

Vijai Lakshmi Pandit, *The Scope of Happiness*

ایک سفر

ڈیگوگارشیا سے لے کر لکادیپ تک سمندر میں جگہ جگہ چٹانی ابھار اس طرح پھیلا ہوا ہے جیسے کسی نے اتھاہ پانی کے درمیان لکڑی کے بہت سے تنے ڈال دئے ہوں۔ اسی لمبے سلسلہ کے درمیان وہ "ملک" ہے جس کو جزائر مالدیپ کہتے ہیں۔ یہ جزائر ہندستان کے جنوبی ساحل سے تقریباً ۴۰۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔

مالدیپ کے بارہ میں راقم الحروف نے سب سے پہلے الجمعیۃ ویکلی ۲۹ مارچ ۱۹۷۴ء میں ایک مفصل مضمون شائع کیا تھا۔ اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا گیا تھا: مالدیپ کا رقبہ صرف ۳۰۰ مربع کلومیٹر ہے، مگر کلیدی محل وقوع کی وجہ سے وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اس کی اسی اہمیت کی بنا پر برطانیہ نے پہلی بار مالدیپ (مالے) میں ایک ہوائی اڈہ بنایا۔ دوسری عالمی جنگ میں فوجی اہمیت کے اس ہوائی اڈہ سے برطانیہ نے بہت کام لیا تھا۔ بحر ہند کے درمیان اس ہوائی اڈہ کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ انگریز واقعۃً دوررس نظر رکھتے تھے۔ اسی لئے وہ دنیا کے اتنے بڑے رقبہ پر حکومت کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

الجمعیۃ کے اس مضمون میں راقم الحروف نے مزید لکھا تھا: جزائر مالدیپ کی پوری آبادی مسلمان ہے۔ یہ پانچ سو سال پہلے کے اس واقعہ کی یادگار ہے جب کہ عرب تاجروں کے ذریعہ اسلام جنوبی ہند کے ساحل سے لے کر سیلون، مشرقی بنگال، ملیشیا اور چین تک پھیل رہا تھا۔ پندرھویں صدی کے آخر میں پرتگالی قافلے بحر ہند میں آگئے، اور انھوں نے اس علاقہ سے عربوں کی تجارت منقطع کر دی۔ اس کے بعد اس علاقہ میں اسلام کی اشاعت کا کام بھی بند ہو گیا (صفحہ ۱۰)

مالدیپ کے لئے میرا پہلا سفر جنوری ۱۹۸۲ میں ہوا۔ یہ سفر ایک اسلامی کانفرنس کی دعوت پر تھا۔ اس سفر کی روداد الرسالہ مئی ۱۹۸۲ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کانفرنس میں مجھے ایک مقالہ "جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا میں اسلام کی اشاعت" کے موضوع پر پیش کرنا تھا۔ مقالہ کی تیاری کے لئے کتابوں کی ضرورت تھی۔ دہلی کے مسلم اداروں میں مجھے اس موضوع پر کوئی کتاب نہ مل سکی اس کے بعد میں نے دہلی کے ایک مسیحی ادارہ کو ٹیلیفون کیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ آج شام

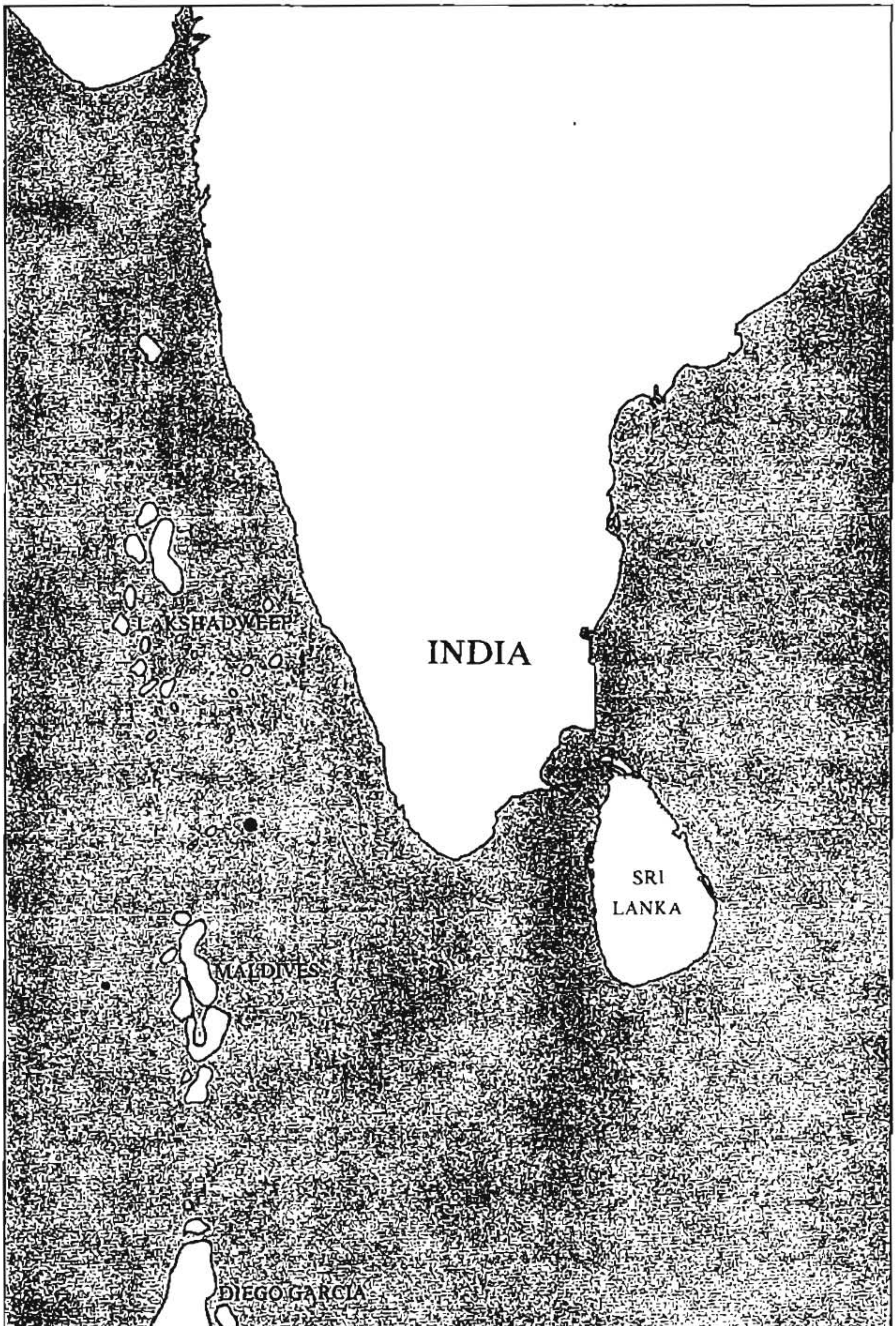
INDIA
LAKSHADWEEP
SRI LANKA
MALDIVES
DIEGO GARCIA

کو ہماری لائبریری میں آجائیں۔ شام کو میں وہاں پہنچا تو انھوں نے دس انگریزی کتابیں خاص اسی موضوع پر میرے حوالے کر دیں ـــــــ کتنا فرق ہے ایک میں اور دوسرے میں۔

مالدیپ کے لئے میرا دوسرا سفر دسمبر ۱۹۸۷ میں ہوا۔ یہ سفر دوبارہ ایک انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس میں شرکت کے لئے تھا جس کا اہتمام حکومت مالدیپ کے تعاون سے کیا گیا تھا۔

۵ دسمبر ۱۹۸۷ کی صبح کو فجر سے پہلے گھر سے روانہ ہونا تھا۔ ۴ دسمبر کی شام کو مختلف کاموں میں دیر ہوگئی اور میں ساڑھے بارہ بجے سے پہلے بستر پر نہ جا سکا۔ سوتے وقت دل سے دعا نکلی کہ خدایا مجھے تین بجے جگا دیجئے۔ تاخیر کی وجہ سے نیند بھی کسی قدر دیر میں آئی۔ میں گہری نیند سو گیا۔ بالکل بے خبر سو رہا تھا کہ خلاف معمول اچانک نیند کھل گئی۔ دیکھا تو گھڑی کی ایک سوئی تین پر تھی اور دوسری سوئی بارہ پر۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ دل نے کہا کہ اللہ کی مدد ٹھیک اپنے وقت پر آتی ہے۔ اگرچہ انسان اپنی عجلت پسندی کی وجہ سے گھبرا اٹھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شاید خدا کی مدد آنے والی نہیں۔

۵ نومبر ۱۹۸۷ کی صبح کو انڈین ایرلائنز کی فلائٹ نمبر ۴۶۷ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ میرے پاس جو ریٹرن ٹکٹ ہے، اس پر لکھا ہوا ہے: دہلی ـــــ مالدیپ ـــــ دہلی۔ اس کو دیکھ کر خیال آیا کہ اسی طرح ہر آدمی کے پاس ایک اور ریٹرن ٹکٹ ہے۔ یہ دوسرا ٹکٹ بظاہر دکھائی نہیں دیتا۔ مگر اس پر غیر تحریری زبان میں پختہ طور پر لکھا ہوا ہے: آخرت ـــــ دنیا ـــــ آخرت۔ مجھے دہلی سے مالدیپ پہنچ کر وہاں چند دن قیام کرنا ہے اور پھر دوبارہ دہلی واپس آجانا ہے۔ اسی طرح ہر آدمی جو یہاں ہے وہ آخرت سے دنیا میں آیا ہے، اور دوبارہ اس کو یہاں سے آخرت کی طرف جانا ہے۔ پہلی قسم کے سفر کو ہر شخص جانتا ہے، مگر دوسری قسم کے سفر کو جاننے والے اتنے کم ہیں کہ دوربین اور خوردبین سے تلاش کرنے پر بھی کہیں کوئی نہیں ملتا۔

ہوائی جہاز کے اعلانات میں ہمیشہ ایک ضروری اعلان سگرٹ نوشی کے بارہ میں ہوتا ہے ـــــ ٹوائلٹ میں اسموکنگ نہ کریں، لینڈنگ کے وقت اسموکنگ نہ کریں، وغیرہ۔ اعلان کرنے والا سگرٹ نوشی کے بارہ میں ہمیشہ "نہ کریں" والے مواقع کو بتاتا ہے، وہ "کریں" والے موقع کا اعلان نہیں کرتا۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کے بارہ میں "کریں" والی بات کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو آدمی بتائے بغیر کرے گا۔ ایسی چیزوں کیلئے صرف "نہ کریں" والا پہلو یاد دلانے

کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنے طبعی تقاضوں کے جوش میں وہ اس دوسرے پہلو کو بھول جاتا ہے۔

جہاز میں مختلف اخباروں کے ساتھ ہندی روزنامہ نوبھارت ٹائمس (۵ نومبر ۱۹۸۷) بھی تھا۔ میں نے اس کو کھولا تو درمیان کے صفحہ پر ایک مضمون تھا جس کا عنوان حسب ذیل الفاظ میں قائم کیا گیا تھا: "پنجاب پر ایک آشاوادی نظر" اڈیٹوریل کے عنوانات یہ تھے: واپسی لمبی ہوگی، عام آدمی کو انصاف۔ آجکل ہندی اخبارات میں جو زبان ہوتی ہے وہ سادہ اردو ہوتی ہے۔ زیادہ بڑا فرق رسم الخط کا ہے۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ ہندستان میں "اردو والوں" کے لئے کبھی وہ چیز پیدا ہونے والی نہیں جس کو لینگوئج گیپ کہا جاتا ہے۔ یعنی زبان کی دوری۔ اصل فرق رسم الخط کا ہوگا۔ اور وہ کوئی زیادہ بڑا فرق نہیں۔

راقم الحروف نے ہندی صرف سات دن پڑھی ہے، روزانہ ایک گھنٹہ کی رفتار سے۔ اعظم گڑھ کے زمانہ قیام میں ایک کائستھ بھولیشور لال نے ایک ہفتہ ہمارے گھر پر آکر ہندی زبان پڑھائی تھی۔ اس سات گھنٹہ کی تعلیم کا یہ نتیجہ ہے کہ میں ہندی کے بڑے حروف (عنوان، پوسٹر، نام) بآسانی پڑھ لیتا ہوں۔ اردو داں لوگ اگر صرف ہندی رسم الخط سیکھ لیں تو وہ کبھی ہندی علاقہ میں اجنبی نہیں ہوں گے۔

انڈین ایرلائنز کے میگزین سواگت (دسمبر ۱۹۸۷) میں ایک مضمون لکادیپ کے بارہ میں تھا۔ لکادیپ جغرافی اعتبار سے بالکل مالدیپ کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ ہندستانی ایڈمنسٹریشن کے تحت ہے۔ یہاں کے ایک حصہ میں مالدیپی زبان بولی جاتی ہے۔ آبادی چالیس ہزار ہے جو سب کی سب مسلمان ہے۔ ۳۶ جزائر کا یہ مجموعہ صرف ۳۲ مربع کلو میٹر کا رقبہ رکھتا ہے۔

مضمون نگار مسٹر پی۔ کے۔ ڈے مالدیپ گئے۔ وہاں سمندر کے کنارے کے خوبصورت سیپ انھیں بہت پسند آئے اور انھوں نے بہت سے سیپ اپنے بیگ میں جمع کر لئے۔ وہ لکھتے ہیں:

> I managed to collect a bagful of sea shells of various shapes and hues. However, many of these I had to throw back as soon as it was discovered that inside these were nestling live hermit crabs!

وہ خوبصورت سیپ جن میں دنیا کے کیکڑے بیٹھے ہوئے ہوں، ان کو ہر آدمی دیکھ لیتا ہے اور اپنے سے دور پھینک دیتا ہے۔ مگر یہاں دوسرے بہت سے خوبصورت سیپ ہیں جن میں آخرت کے کیکڑے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان دوسری قسم کے کیکڑوں کو کوئی نہیں دیکھتا۔ ان کو ہر آدمی اپنے بیگ میں محفوظ کئے ہوئے ہے۔ وہ ان کو صرف آخرت میں پھینکنا چاہے گا۔ مگر اس وقت کا پھینکنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

جہاز میں انگریزی اخبار دکن کرانیکل (۵ دسمبر ۱۹۸۷) نظر سے گزرا۔ اس کی ایک خبر کی سرخی تھی ــــــ معمولی جھگڑے پر موت:

Petty quarrel leads to death

خبر میں بتایا گیا تھا کہ حیدر آباد میں ایک شخص نے رات کے وقت کسی آدمی کا دروازہ کھٹکھٹایا صاحب مکان کو اتنی رات میں دروازہ کھٹکھٹانا قابل اعتراض معلوم ہوا۔ وہ آنے والے سے جھگڑنے لگا۔ اب دوسرا شخص جو اس کا جاننے والا تھا اور سادہ طور پر صرف ملنے کے لئے آیا تھا۔ وہ بھی غصہ میں آکر لڑنے لگا۔ یہاں تک کہ مار پیٹ کی نوبت آگئی اور ایک شخص شدید زخمی ہو کر ہلاک ہو گیا۔

بظاہر یہ دو جاہل آدمیوں کی کہانی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی پوری ملت کی کہانی ہے۔ آج تمام دنیا میں مسلمانوں کا حال یہی ہے کہ وہ معمولی معمولی باتوں پر لڑ جاتے ہیں اور لڑائی شروع ہونے کے بعد ان کی لڑائی دوبارہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک ان کے اندر لڑنے کی سکت ہی ختم نہ ہو جائے ــــــ عراق۔ ایران کی حکومتی جنگ سے لے کر بستیوں کی انفرادی مقدمہ بازی تک ہر جگہ مسلمانوں کا حال یہی ہے۔

راستہ میں ہمارا جہاز کچھ دیر کے لئے کوچن اترا۔ ۲۵ سال پہلے میں ایک بار چند دن کے لئے کوچن آیا تھا۔ اس وقت کی کئی باتیں ابھی تک مجھ کو یاد ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں کوچن سے راس کماری (کیپ کومرن) گیا تھا۔ اس وقت یہاں تعمیرات نہیں ہوئی تھیں۔ ہندستان کے آخری ساحل پر بیٹھ کر دیر تک میں سمندر کے مناظر کو دیکھتا رہا۔ ساحل سے تقریباً نصف فرلانگ کے فاصلہ پر سمندر کے درمیان ایک چٹان تھی۔ اس سے سمندر کا پانی ٹکرا کر اچھلتا تھا تو عجیب منظر پیدا ہوتا تھا۔ سوامی دیویکانند ہندستان کا سفر کرتے ہوئے یہاں آئے تو

انھوں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی ۔ وہ تیرتے ہوئے مذکورہ چٹان کے اوپر پہنچے اور وہاں دھیان گیان کیا۔ اب اس چٹان پر ان کے نام سے بہت بڑا اسٹرکچر بنا یا گیا ہے۔ تاہم قدرت کا سابقہ منظر اب وہاں موجود نہیں ۔

آتے اور جاتے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے جہاز گوا میں ٹھہرا۔ بہت سی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ گوا ۱۵۰۵ سے پرتگال کے قبضہ میں تھا۔ ۱۹۶۲ میں دوبارہ وہ ہندستان کے قبضہ میں آیا۔ آزادی (۱۹۴۷) سے قبل ہندستان میں تین مغربی طاقتیں تھیں۔ زیادہ بڑے حصہ پر انگریز اور چند چھوٹے مقامات پر فرانسیسی اور پرتگالی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے بدلے ہوئے حالات کا اعتراف کرتے ہوئے پر امن طور پر اپنے زیر قبضہ علاقے خالی کر دئے۔ مگر پرتگالی پرامن تخلیہ کے لئے راضی نہیں ہوتے ۔ ملک میں آزاد قومی حکومت کے قیام کے بعد جواہر لال نہرو نے مسلسل یہ کوشش کی کہ پرتگالی پرامن طور پر اپنے علاقے کو آزاد کر دیں۔ مگر وہ راضی نہیں ہوئے۔ آخر کار دسمبر ۱۹۶۱ میں ہندستان نے فوجی کارروائی کرکے بزور گوا پر قبضہ کر لیا۔

اس سلسلہ میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے نہایت بامعنی بات لکھی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ نہرو کے فوجی قبضہ کے بعد مغربی ملکوں میں اس کے خلاف کافی شور و غل ہوا مگر تاریخ کی روشنی میں نہرو کا اقدام جائز تھا۔ برطانی اور فرانسیسی واپسی کے بعد ہندستان میں پرتگالی مقبوضات کی موجودگی ایک خلاف زمانہ حرکت تھی ؛

With the withdrawl of the British and the French, the Portugese colonial presence in India became an anachronism (12/946).

حقیقتِ واقعہ کا اعتراف اگر آپ بخوشی نہ کریں تو بالآخر آپ کو حقیقتِ واقعہ کا اعتراف بجبر کرنا پڑے گا۔ اور دوسری صورت کے مقابلہ میں پہلی صورت یقینی طور پر زیادہ اہون ہے۔

تریوندرم سے جہاز بدلنا تھا، اس لئے یہاں چند گھنٹے رکنا پڑا۔ تریوندرم ریاست کیرلا کا دارالسلطنت ہے جو ساحل سمندر سے ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ تریوندرم کو پہلی بار ۱۷۴۵ میں اہمیت حاصل ہوئی جب کہ راجہ مارتنڈ ادرمالے اس کو اپنی راجدھانی قرار دیا۔ کیرلا یونیورسٹی یہیں قائم ہے۔ مشہور اورینٹل کانفرنس (۱۹۳۷) تریوندرم ہی میں ہوئی تھی۔ اس کے صدر

ڈاکٹر ٹامس (F.F. Thomas) تھے۔ انھوں نے میکس مولر کا حوالہ دیتے ہوئے یہ انوکھی بات کہی تھی کہ سنسکرت اس ملک میں اتنی ہی عام ہے جتنا کہ قدیم یورپ میں لاتینی تھی۔ اور سنسکرت کی ایک سادہ صورت (Simple form) کو پورے ملک کی مشترک زبان بنانے کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے (ڈسکوری آف انڈیا، صفحہ ۱۲۷)

تریوندرم جنوبی ساحل پر واقع ہے جہاں بحر عرب کی لہریں آکر ہندستان کی سرزمین سے ٹکراتی ہیں۔ اس علاقہ کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اسلام عرب تاجروں کے ذریعہ آیا۔ اس طرح یہاں کے لوگ اسلام سے اس خالص تعمیری پہلو کی حیثیت سے آشنا ہوئے جس کو پنڈت جواہر لال نہرو نے شاندار کلچر (Brilliant culture) سے تعبیر کیا ہے۔

عرب تاجروں کے غیر سیاسی اور تعمیری انداز نے لوگوں کو اسلام کا گرویدہ بنا دیا۔ نہ صرف عوام بلکہ راجے اور مہاراجے بھی اسلام سے شدید طور پر متاثر ہوئے۔ کالی کٹ کے راجہ زمورن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عرب تاجروں کا سرپرست بن گیا۔ اور اپنی رعایا میں قبول اسلام کی حوصلہ افزائی کرنے لگا (پریچنگ آف اسلام، ۲۶۹)

پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے کہ سولھویں صدی کے آغاز میں موپلا نومسلم مالابار کی آبادی کا تقریباً پانچواں حصہ تھے۔ اگر پرتگالی اس علاقہ میں نہ پہنچتے تو اس ساحل کے تمام لوگ مسلمان ہو جاتے۔ کیوں کہ وہ کثرت سے اسلام قبول کر رہے تھے اور مسلم تاجروں کا طبقہ ان کے اوپر نہایت گہرا اثر ڈال رہا تھا (۲۶۹)

ہندستان میں "ملک" ایک واحد جغرافی خطہ کا نام ہوتا ہے۔ مگر جب آپ مالدیپ کی فضا میں پہنچ کر نیچے کی طرف نظر ڈالیں تو "ملک" کا تصور بالکل بدلا ہوا ہوگا۔ یہاں "ملک" ایک ایسے مجموعہ کا نام ہے جو منتفرق صورت میں سمندر کے اندر دور دور تک بکھرا ہوا ہو۔ مالدیپ ۱۰۸۷ چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ہے۔ ان کا مجموعی رقبہ ۲۹۸ مربع کیلومیٹر ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے سمندر میں تقریباً ساڑھے سات سو کیلومیٹر لمبائی اور تقریباً سوا سو کیلو میٹر چوڑائی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے صرف ۲۱۹ جزیرے آباد ہیں جن میں یہاں کے تقریباً پونے دو لاکھ باشندے رہتے ہیں۔ باقی جزیرے زیادہ تر جنگلات کی صورت میں ہیں۔ مالے (Male) نامی

جزیرہ یہاں کا دار السلطنت ہے۔ یہ جزیرہ صرف ایک میل چوڑا اور ڈیڑھ میل لمبا ہے۔

مالدیپ کے سابق وزیر اعظم مسٹر احمد ذکی مارچ ۱۹۷۴ میں ہندستان آئے تھے۔ یہاں انھوں نے ایک بیان میں کہا تھا کہ " ان کا ملک چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بٹا ہوا ہے، اس بنا پر رسل ورسائل (Communication) کی بہت دشواری ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔" آزادی (۱۹۶۵) کے بعد مالدیپ نے اس میدان میں خصوصی توجہ دی۔ اب یہ مسئلہ کافی حد تک حل ہو چکا ہے۔ تمام آباد جزائر میں بندرگاہیں بنی ہوئی ہیں۔ جدید طرز کی کشتیاں جزائر کو مربوط کرنے کے لئے ہر وقت سمندر میں دوڑتی رہتی ہیں۔ وائرلیس کا عمدہ نظام قائم ہے جس کی وجہ سے ایک لمحہ میں ایک جزیرہ اور دوسرے جزیرہ کے درمیان ربط قائم کیا جا سکتا ہے۔

ان چیزوں کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ مالدیپ کے ذمہ دار اگر یہ مہم چلاتے کہ مالدیپ کے ۱۰۸۷ جزیروں کو ملا کر ایک کر دیا جائے تاکہ دوسرے ملکوں کی طرح ان کا ملک بھی ایک واحد زمینی خطہ بن جائے جس میں اس سرے سے اس سرے تک سڑکیں ہوں اور ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ریلیں دوڑتی ہوں۔ اگر وہ ایسی مہم چلاتے تو وہ صرف ایک بے فائدہ لفظ بازی ہوتی جس کا موجودہ اسباب کی دنیا میں کوئی حاصل نہیں۔ مگر انھوں نے اس قسم کی کوئی مہم نہیں چلائی۔ اس کے برعکس انھوں نے صورت واقعہ کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے حسب حال اپنے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۵ سال کے اندر ان کا مسئلہ حل ہو گیا۔ جب کہ جزائر کی یکجائی کے لئے ان کی "مطالباتی مہم" ۲۵ ہزار سال میں بھی کسی نتیجہ پر پہنچنے والی نہیں تھی۔

اس دنیا میں کامیابی کی پہلی شرط حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے۔ حقیقت واقعہ کے اعتراف کے بعد ہی کسی شخص یا قوم کا سفر شروع ہوتا ہے۔ جو لوگ حقیقت واقعہ کا اعتراف نہ کریں، ان کا سفر ہی شروع نہیں ہوگا۔ اور جس سفر کا آغاز نہ ہوا ہو وہ سفر اختتام پر کیسے پہنچ سکتا ہے۔

۵ دسمبر ۱۹۸۷ کی سہ پہر کو مالدیپ پہنچے۔ یہاں کا خاص شہر اور دار السلطنت مالے ہے۔ مالے سے کچھ فاصلہ پر ایک چھوٹا اور لمبا جزیرہ ہے۔ اس جزیرہ پر ہوائی اڈہ بنا ہوا ہے۔ اس جزیرہ کا رقبہ بس اتنا ہی ہے کہ وہ ایک اوسط درجہ کے ہوائی اڈہ کے طور پر استعمال ہو سکے۔

اس کا طرز تعمیر عام ہوائی اڈوں سے مختلف ہے۔ وہ جس طرح فطری ماحول میں ہے، اسی طرح وہ فطری انداز میں بنایا گیا ہے اور نہایت خوبصورت ہے۔

ہوائی اڈہ اور مالے کے درمیان سمندر حائل ہے۔ یہ فاصلہ جدید طرز کی موٹر بوٹ کے ذریعہ طے ہوا۔ یہ سفر اس درجہ پرکشش تھا کہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک عرب شیخ بار بار "جمیل، جمیل" کہے جا رہے تھے۔ ہمارے پیچھے ہوائی اڈہ پر جہاز رن وے پر دوڑ رہا تھا، اور ہمارے سامنے مشینی کشتی سمندر کی موجوں کو پھاڑتی ہوئی آگے چلی جا رہی تھی۔ چاروں طرف آفاقی مناظر اور حسین فطرت آدمی کو مبہوت کر رہے تھے۔ اس تجربہ کے زیر اثر میں ہوٹل کے کمرہ میں داخل ہوا تو وہاں دیوار پر ایک خوبصورت تصویر تھی جس میں سمندر کے پس منظر میں جزیرہ کو دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر کے نیچے انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

A taste of paradise

میں نے سوچا کہ جس جنت کی دور کی ایک جھلک اتنی حسین ہو، وہ جنت خود کتنی زیادہ حسین ہوگی۔ بے اختیار یہ دعا نکلی کہ خدایا، میرے پاس کوئی عمل نہیں جس سے میں جنت جیسی قیمتی چیز کا امیدوار بن سکوں دوسرے لوگوں کو آپ جنت بطور جزا دیں گے، مجھ کو جنت بطور عطیہ دے دیجئے۔

موٹر بوٹ سے اتر کر سڑک پر آئے تو وہاں سب سے پہلے جو چیز نظر کے سامنے تھی وہ ایک بڑا سا بینر تھا جس پر لکھا ہوا تھا: مرحبا بالعلماء المسلمين على ارض الاسلام (اسلام کی سرزمین پر مسلم علماء کا آنا مبارک) یہ گویا پہلی تحریری علامت تھی کہ اب ہم اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں مذکورہ انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس کا انعقاد ہونے والا ہے۔

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں مالدیپ کے تذکرہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ گمان غالب ہے کہ مالابار کے راستہ سے اسلام مالدیپ میں پہنچا۔ اس جزیرے کے باشندے عرب اور ایرانی تاجروں کے ذریعے مسلمان ہوئے۔ یہ تاجر ان علاقوں میں آباد ہوتے۔ انھوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں کیں اور اس طرح انھوں نے یہاں مؤثر تبلیغ کا راستہ ہموار کیا۔ اندازہ ہے کہ مالدیپ میں پہلا اسلام قبول کرنے والا شخص سلطان احمد شنورازہ تھا جو ۱۲۰۰ء کے قریب مسلمان ہوا۔ (صفحہ ۲۷۳) کچھ مورخین کا خیال ہے کہ لگ بھگ ۵۰۰ء میں سیلون سے کچھ بدھسٹ یہاں آکر آباد

ہوئے۔ ۱۲ویں صدی عیسوی میں ان لوگوں نے اجتماعی طور پر اسلام قبول کر لیا۔

جناب ابراہیم شہاب (اسپیکر) نے مالدیپ میں اسلام کے آغاز کی تاریخ کسی قدر مختلف انداز میں بتائی۔ انھوں نے کہا کہ پہلے یہاں ایک راجہ تنری بھونا دیت تھے۔ ان کے زمانہ میں مغرب (افریقہ) سے ایک "ولی" ابوالبرکات یوسف البربری یہاں آئے۔ ۵۴۸ھ میں ان کے ہاتھ پر راجہ مسلمان ہو گیا۔ اور اپنا نام محمد بن عبد اللہ رکھا۔ اس کے بعد تھوڑی مدت میں مالدیپ کے تمام باشندے مسلمان ہو گئے۔

جناب ابراہیم شہاب نے ایک اور عجیب بات یہ بتائی کہ سابق سلطان کا خاندان مالدیپ میں نئے حالات سے مکمل موافقت کرکے رہتا ہے۔ دوسرے باشندوں کی طرح اس کے افراد یا سروس میں ہیں یا تجارت میں۔ کسی شاہی خاندان کے لئے بدلے ہوتے حالات سے مطابقت کی یہ انوکھی مثال ہے جو غالباً یہاں کے سادہ فطری مزاج کی دین ہے۔

مالدیپ جیسے چھوٹے ممالک قدیم زمانہ میں ہمیشہ خطرہ کی حالت میں رہتے تھے۔ کسی بھی صبح و شام کوئی بڑی طاقت اگر ان پر قبضہ کر سکتی تھی۔ مثلاً پرتگالی ۱۵۵۸ میں آکر مالدیپ پر قابض ہو گئے۔ ان کا قبضہ ۱۵۷۳ تک جاری رہا۔ سترہویں صدی عیسوی میں وہ ڈچ حکمرانوں کے ماتحت رہا۔ ۱۸۸۷ سے وہ برطانیہ کے قبضہ میں چلا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد نو آبادیاتی نظام کمزور ہوا تو ۱۹۶۵ میں اس کو برطانیہ سے آزادی حاصل ہوگئی۔ ۱۹۶۸ سے مالدیپ میں مکمل جمہوریہ قائم ہے۔ موجودہ دور میں پہلی بار یہ ممکن ہوا ہے کہ چھوٹی قومیں بھی اپنی آزاد حکومت قائم کر سکیں۔ مالدیپ ۱۹۶۵ سے اقوام متحدہ کا ممبر ہے۔ یہاں تقریباً ۸۵ فی صد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔

مساوات اور قومی سالمیت اور انسانی آزادی کے احترام کا دور جو موجودہ زمانہ میں پیدا ہوا ہے اس کو عام طور پر لوگ اس جدید مغربی انقلاب سے منسوب کرتے ہیں جس کی ایک علامت اقوام متحدہ ہے۔ مگر خود جدید انقلاب اور اقوام متحدہ اس اسلامی انقلاب کی پیداوار ہیں جو چودہ سو سال پہلے پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب نے عالمی سطح پر پیدا کیا تھا۔

۱۶ویں صدی کے پرتگالی سیاح باربوسا (Duarte Barbosa) نے جنوبی ہند کا سفر کیا تھا۔ وہ ۱۵۰۴ اور ۱۵۱۷ کے درمیان دجیا نگرم آیا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں

مالدیپ میں جہاز سازی کی صنعت قائم تھی۔ اور جنوبی ہند کے لوگ اپنی ضرورت کے جہاز مالدیپ میں بنوایا کرتے تھے۔ وجیانگرم کے راجہ کے جہاز بھی مالدیپ سے بن کر آتے تھے۔

جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں لکھا ہے کہ سلطان ٹیپو کا باپ حیدر علی (۱۷۲۲ - ۱۷۸۲) نہایت عزم اور حوصلہ والا آدمی تھا۔ وہ ہندستان کی تاریخ میں ممتاز شخصیت کا مالک تھا۔ وہ پورے ملک کا لیڈر بننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ حیدر علی نے دوسروں سے بہت پہلے سمندری طاقت کا اندازہ کر لیا تھا اور یہ سمجھ گیا تھا کہ انگریزوں کی کامیابی کا اصل راز بحری طاقت میں ان کی برتری ہے۔ اس نے خود اپنا ایک بحری بیڑہ بنانا چاہا اور مالدیپ پر قبضہ کر کے اس کو جہاز سازی اور بحری سرگرمیوں کا مرکز بنانے کی کوشش کی :

He started building his own navy and, capturing the Maldive Islands, made them his headquarters for ship building and naval activities (p. 275).

مالدیپ کے ساحل پر جب میں نے یورپ کی بنی ہوئی مشینی کشتیوں کی قطاریں دیکھیں تو میں نے کہا : روایتی جہاز سازی کے دور میں مالدیپ جہاز کا "تاجر" تھا، مگر سائنسی جہاز سازی کے دور میں مالدیپ صرف "خریدار" بن کر رہ گیا۔ یہی موجودہ زمانہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں کا حال ہے۔ مسلمان دور قدیم میں سب سے آگے تھے، مگر دور جدید میں وہ سب سے پیچھے ہو گئے۔

یہاں میرا قیام نسن دھرا پیلیس ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۰۸ میں تھا۔ یہ عین سمندر کے کنارے واقع ہے۔ ایک طرف ہوٹل کی عمارتوں کی صورت میں انسانی مصنوعات کا منظر ہے اور دوسری طرف سمندر کی لہروں اور پھیلے ہوئے آسمان کی صورت میں خدائی مصنوعات کا۔ ہوٹل اور سمندر کے درمیان صرف ایک سڑک حائل ہے۔ سمندر کا یہ منظر میرے لئے ہمیشہ وسخر لکم ما فی السموات والارض کی تصویر ہوتا ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے جزیروں کے مقابلہ میں سمندر ہیبت ناک حد تک بڑا ہے۔ مگر اس کی موجیں ساحل کو چھو کر اس طرح واپس چلی جاتی ہیں جیسے کہ ان کو ایک برتر حکم کے تحت پابند کر دیا گیا ہو کہ تمہاری حد یہاں ختم ہو گئی، اس سے آگے تجاوز کرنے کی تمہیں اجازت نہیں۔

زندہ چیزوں میں ہاتھی اور غیر زندہ میں سمندر کا انسان کے لئے مسخر ہونا انتہائی عجیب ہے۔

اگرچہ مسخر لکم ما فی السموات والارض کے دوسرے بے شمار پہلو ہیں جو اس سے بھی زیادہ عجیب ہیں۔ مگر ان کو جاننے کے لئے سائنسی معلومات کی ضرورت ہے لیکن ہاتھی اور سمندر کا مسخر ہونا ایسے کھلے ہوئے واقعات ہیں جن کو ایک عام آدمی بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ اور ان سے اپنے لئے سبق حاصل کر سکتا ہے۔

مالدیپ کو "سیاحوں کی جنت" کہا جاتا ہے یہاں کثرت سے مغربی ملکوں کے لوگ تفریح اور سیاحت کے لئے آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں سے یہاں میری گفت گو ہوئی۔ میرا عام تاثر یہ ہے کہ مسلمانوں میں اور مغربی اقوام میں ایک خاص فرق پایا جاتا ہے۔ اگر آپ ایک مسلمان سے کسی موضوع پر گفتگو کریں تو اس کے لئے انتہائی مشکل ہوگا کہ وہ اپنے ذاتی خیالات سے الگ ہو کر آپ کی بات سن سکے۔ وہ آپ کی بات کو اس طرح سنتا ہے جیسے کہ کب آپ کی بات ختم ہو اور وہ دوبارہ اپنے دماغ کا ٹیپ کھول دے۔

میں نے اپنے تجربہ میں بار بار یہ محسوس کیا ہے کہ اس معاملہ میں مغربی انسان کا حال بالکل مختلف ہے۔ ذاتی طور پر وہ خواہ کوئی بھی خیال رکھتا ہو، مگر جب آپ اس سے ایک بات کہیں تو وہ اپنے خیالات سے جدا ہو کر آپ کی بات کو سنے گا۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ خالی الذہن ہو گیا ہے اور ہر دوسری چیز سے بالکل بے تعلق ہو کر آپ کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ بے حد اہم فرق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب سے بڑا سبب ہے جس نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جمود کی حالت میں مبتلا کر دیا ہے، اور مغربی قومیں مسلسل ترقی کی طرف اپنا سفر جاری کئے ہوئے ہیں۔

یہاں ایک پاکستانی افسر سے ملاقات ہوئی۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور اگست ۱۹۴۷ میں پاکستان منتقل ہو گئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ میرا ڈس ایڈوانٹج یہ ہے کہ میں ایک "اردو اسپیکنگ مہاجر" ہوں، اس لئے بڑی ترقیوں کے دروازے میرے لئے بند ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بہار اگر وہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے پاکستان میں بے حیثیت ہو رہا ہے۔ ان کے الفاظ میں "ان مہاجرین کے اندر Nuisance value تو ہے، مگر ان کے اندر Democratic value نہیں اس لئے وہ شور وغل تو کر سکتے ہیں، مگر وہ ملک کے ڈھانچہ میں کوئی موثر تبدیلی لانے کی طاقت نہیں رکھتے ـــــــ جو لوگ "ہندو اکثریت" سے خائف ہو کر پاکستان چلے گئے تھے، وہ دوبارہ

خود "مسلم اکثریت" کا شکار ہو کر رہ گئے۔

یہ بات جو مذکورہ پاکستانی نے اپنے ملک کے بارہ میں کہی، یہی ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں بھی درست ہے۔ یہاں کے مسلمان جلسے جلوس، تقریروں اور بیانوں کے ہنگامے تو دکھا رہے ہیں مگر وہ ملکی نظام پر اثر انداز نہیں ہو پاتے۔ اور اس کی مشترک وجہ یہ ہے کہ وہ اقلیت میں ہیں اور اسی کے ساتھ غیر منظم بھی۔ ان کے موجودہ طریق کار کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ صرف غوغائی گروہ Clamorous group کا لقب حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کو اس کے بجائے "تخلیقی گروہ" بننا چاہئے۔ انھیں احتجاج اور مطالبہ کے بجائے اپنی افادیت ثابت کرکے اس ملک میں اپنا مقام حاصل کرنا چاہئے۔

ایک اور پاکستانی مسلمان نے بتایا کہ ۱۹۸۶ میں کراچی میں شیعہ سنی فساد کا سبب جلوس تھا۔ شیعہ حضرات نے ایک ایسے راستہ سے اپنا جلوس نکالا جس پر سنی حضرات کو اعتراض تھا۔ انھوں نے روٹ بدلنے پر اصرار کیا۔ تاہم روٹ میں تبدیلی نہ ہو سکی اور فساد ہو گیا۔ یہی کہانی ہندستان میں بھی بار بار دہرائی جا رہی ہے۔ جلوس کے روٹ پر اعتراض کا سبب غالباً مسلمانوں کا بڑھا ہوا جذبہ فخر ہے۔ جلوس کو مسلمان شان وشوکت کا مظاہرہ سمجھتے ہیں، اس لئے غیر قوم کے جلوس کا اپنے علاقہ سے گزرنا انھیں گوارا نہیں ہوتا۔ مسلمانوں سے اگر جھوٹے فخر کی یہ نفسیات ختم ہو جائے تو جلوس جیسی چیزوں پر فساد برپا ہونے کا سلسلہ بھی یقیناً ختم ہو جائے گا۔

ڈاکٹر شیر چودھری جنوبی افریقہ سے آئے تھے۔ وہ اصلاً پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر اب افریقہ میں وہاں کے شہری کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔ انھوں نے ایک گفتگو کے دوران بہت دل چسپ بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی اصلاح کیسے ہو۔ کوئی شخص جب مسلمانوں کی اصلاح کے لئے نکلتا ہے، تو خواہ وہ جدھر بھی نکلے، فوراً راستہ میں ایک مردہ آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کا سفر وہیں رک جاتا ہے (مردہ کھڑا ہونے سے ان کی مراد کیا تھی، اس کی تشریح ناظرین خود کر سکتے ہیں)

مذکورہ اسلامی کانفرنس کا ایجنڈا (جدول الاعمال) حسب ذیل تھا:

عالمی اسلامی مسائل پر رپورٹ

اسلامی تعلیم کا جائزہ

مشکلات جو عالم اسلامی کو درپیش ہیں (المشاکل التی تواجہ العالم الاسلامی)

دنیا میں مسلم اقلیتوں کی حالت (اوضاع الاقلیات الاسلامیۃ فی العالم)

دعوت اسلامی میں مسلم عورت کا حصہ (دور المرأۃ المسلمۃ فی الدعوۃ الاسلامیۃ)

۷ دسمبر سے ۱۱ دسمبر تک ان موضوعات پر بحث و گفتگو جاری رہی۔ اپنے عام طریقہ کے مطابق میں اس سفر نامہ میں رپورٹ کے انداز کی تفصیلات درج نہیں کروں گا۔ میں صرف ان چند یادوں کو پیش کروں گا جن میں کوئی سبق ہے اور جن میں عام لوگوں کے لئے غور و فکر کا سامان ملتا ہے۔

کانفرنس کا افتتاح ۷ دسمبر ۱۹۸۷ کی صبح کو اسلامک سنٹر کے ہال میں کیا گیا۔ یہ وسیع اور خوبصورت اسلامک سنٹر ابھی حال میں مختلف اسلامی ملکوں کے تعاون سے تعمیر کیا گیا ہے۔ کارروائی کا آغاز مالدیپ کے ایک قاری کی قرأت قرآن سے ہوا۔ قاری جب قرآن کی قرأت کر رہا تھا تو اچانک مجھے یاد آیا کہ دنیا کے جس گوشہ میں بھی میں نے کسی شخص کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا ہے، اس کی زبان اور اس کا لہجہ ہمیشہ ٹھیک وہی ہوتا ہے جو یہاں اس چھوٹے سے جزیرہ میں مجھ کو سنائی دے رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا چودہ سو سال پہلے ایک زندہ ٹیپ تیار کیا گیا تھا، یہ ٹیپ آج بھی اپنی اصل صورت میں محفوظ ہے اور اسی ابتدائی آواز میں ہر جگہ لوگوں کو خدا کا ابدی پیغام سنا رہا ہے۔

مالدیپ کے صدر مامون عبد القیوم کے کلمات سے کانفرنس کی کارروائی شروع ہوئی۔ انھوں نے اپنی عربی تقریر میں خصوصیت کے ساتھ باہمی اتفاق و اتحاد پر زور دیتے ہوئے کہا:

لقد نسینا قول اللہ عز وجل (ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم) ونسینا قول رسولہ الکریم (لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا ولا تقاطعوا وکونوا عباد اللہ اخوانا)

میں نے سوچا کہ مسلمان کس قدر خوش قسمت ہیں کہ خدا و رسول کے کلام کی صورت میں ان کے پاس ایک ایسا مستند ہدایت نامہ موجود ہے جس کا حوالہ باہمی معاملات میں دیا جا سکتا ہو اور جس کے

آگے تمام لوگوں کی گردنیں جھک جائیں۔ اس کے باوجود کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کا حال موجودہ زمانہ میں ایسا ہو رہا ہے جیسے کہ ان کے پاس کوئی متفقہ فکری اور اعتقادی بنیاد ہی نہیں — کسی قوم کے افراد میں اگر بے حسی پیدا ہو جائے تو انتہائی قیمتی پیغام بھی اس کے لئے بے اثر ہو جاتا ہے۔

مجھے جہاں کہیں بھی موقع ملا، میں نے دعوت کے پہلو پر زور دیا۔ ایک عرب مقرر نے اپنی تقریر میں کہا کہ کیف ندعوا غیر المسلمین الی الاسلام و المسلمون منہزمون امام اعدائہم (ہم کیسے غیر مسلموں کو اسلام کی طرف دعوت دے سکتے ہیں جب کہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے سامنے شکستہ اور مغلوب ہو رہے ہیں) میں نے کہا کہ قدیم مکہ میں مسلمان اپنے دشمنوں سے مغلوب تھے، اس کے باوجود انھوں نے ان کو دعوت دی اور کامیابی حاصل کی۔ تاتاری حملہ کے بعد مسلمان مغلوب ہو گئے تھے، پھر بھی انھوں نے ان کو دعوت دی اور اسلامی دعوت کے ذریعہ دوبارہ مسلم دنیا میں اسلام کی ایک نئی تاریخ ظہور میں آئی۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان ہر دوسرے پروگرام کو فوراً سمجھ لیتے ہیں۔ مگر خالص اسلامی دعوت کا پروگرام ان کی سمجھ میں نہیں آتا، اگرچہ اس کے حق میں کتنے ہی زیادہ دلائل پیش کر دئے جائیں۔ دوسرے پروگراموں کی مسلسل ناکامی کے باوجود اس طریقہ کے بارے میں ان کا یقین ختم نہیں ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر "مسائل دنیا" کا غلبہ ہے، ان کے اوپر "مسائل آخرت" کا غلبہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قومی اور دنیوی نوعیت کے مسائل فوراً ہر شخص کی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ مگر ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں مسلمانوں کو اقوام عالم کے اوپر گواہ بنانا چاہتا ہے اور آخرت کی یہ گواہی وہ اسی وقت دے سکتے ہیں جب کہ اس سے پہلے دنیا میں انھوں نے دعوت الی اللہ کا کام کیا ہو۔

عام طور پر لوگ بڑے بڑے واقعات سے دلچسپی لیتے ہیں۔ اس کے برعکس مجھے ہمیشہ ان چیزوں سے دلچسپی ہوتی ہے جن کو لوگ معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً بین اقوامی اجتماعات میں فوری ترجمہ کا انتظام۔ یہ ایک عام اور معلوم بات ہے۔ مگر جب میں اس کو دیکھتا ہوں تو وہ مجھ کو اتنا عظیم معلوم ہوتا ہے کہ شدت تاثر سے میرے جسم میں تھرتھری پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک شخص عربی زبان میں تقریر کر رہا ہے۔ عین اسی وقت اس کی تقریر انگریزی زبان میں منتقل کی جار ہی ہے۔ مثلاً ایک مقرر اپنی تقریر کے دوران ایک تجویز پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: لذالك انی اقترح، عین اسی وقت مترجم کہتا ہے Therefore I propose اسی طرح مثلاً ایک شخص کی تقریر کے دوران دوسرا شخص مداخلت کرتے ہوئے کہتا ہے: نقطة نظام۔ عین اسی وقت مترجم کہتا ہے: Point of order بظاہر یہ ایک انسانی واقعہ ہے مگر جب میرے سامنے یہ واقعہ گزرا تو وہ مجھے ایک خدائی کرشمہ معلوم ہونے لگا۔ میں نے سوچا کہ دو الگ الگ ذہنوں کے درمیان ایک انتہائی پیچیدہ معاملہ میں انتہائی کامل مطابقت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ دونوں شخصیتوں کا خالق (بالفاظ دیگر منصوبہ ساز) ایک ہو۔ اور دونوں کا منصوبہ ساز ایک ہستی کو ماننے ہی یہ ماننا بھی لازم ہو جاتا ہے کہ انسان کا خالق "شعور" ہے نہ کہ بے روح مادی اسباب کا اندھا تعامل۔

اسی طرح بڑی کانفرنسوں میں یہ منظر عام ہے کہ ٹیلی وژن کے آدمی مشینیں لئے ہوئے موجود ہیں اور لوگوں کی آوازیں اور ان کی حرکات ریکارڈ کر رہے ہیں۔ ۹ دسمبر کی رات کو میٹنگ چل رہی تھی۔ حسب معمول دو آدمی اپنی مشینوں کے ساتھ اپنی کارگزاری میں مصروف تھے۔ میں نے اس منظر کو دیکھا تو اچانک وہ میرے ذہن میں اس واقعہ میں مبدل ہو گیا جس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے: اذ یتلقی المتلقیان عن الیمین وعن الشمال قعید (ق : ۱۷) ایک منٹ کے لئے مجھے ایسا لگا جیسے واقعۃً ہمارے دونوں طرف فرشتے کھڑے ہوئے ہیں اور نہایت صحت کے ساتھ ہمارے قول و عمل کا ریکارڈ تیار کر رہے ہیں۔

ایک بزرگ (شیخ راشد فرحان) نے کہا تھا کہ ہمیں سیاست سے الگ رہ کر صرف دعوت کے کام پر مرتکز رہنا چاہئے۔ اس پر ایک نوجوان نے پرجوش طور پر کہا کہ اسلام صرف مذہب نہیں، اسلام سیاست بھی ہے۔ اس لئے ہم اپنے پروگراموں سے سیاست کو الگ نہیں کر سکتے۔ اس کے جواب میں ڈکتور اسکندر نے کہا: یہ صحیح ہے کہ اسلام دین اور سیاست دونوں ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اسلام حکمت بھی ہے۔ اور حکمت کا تقاضا ہے کہ اس وقت ہم سیاسی مسائل سے الگ رہیں۔ ورنہ کوئی بھی کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ہم کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ کل کو لینے

کی کوشش میں جزء کو بھی کھودیں، حتی کہ خود دعوت کو بھی۔

ایک عرب نوجوان نے پرجوش طور پر اس چیز کا ذکر کیا جس کو آجکل صحوۃ اسلامیۃ (اسلامی بیداری) کہا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ صحوہ اسلامیہ نہیں ہے بلکہ صحوہ قومیہ ہے۔ ان تحریکوں کے پیچھے رومانی جوش کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے منفی دھوم میں تو ضرور اضافہ کیا ہے۔ مگر ان کے ذریعہ اب تک کوئی مثبت انجام ظاہر نہ ہوسکا۔

اسلامی صحافت کے موضوع پر کلام کرتے ہوئے ایک صاحب نے کہا جو لندن سے آئے تھے، کہ ہمارے نزدیک اسلامی صحافت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو معصوم فرض کرتے ہوئے صرف اغیار کو ظالم اور فاسد بتایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ایک طرف ہماری یہ "اسلامی صحافت" ہے۔ دوسری طرف یہودی صحافت کا حال یہ ہے کہ میں یہودیوں کے بڑے بڑے اخبارات کو پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ میں نے پایا ہے کہ یہودی اخبارات میں کسی تحفظ کے بغیر یہودیوں کے درمیان پائی جانے والی خرابیوں کو بتایا جاتا ہے اور کوئی یہودی اس کو برا نہیں مانتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مسلمانوں کی یہ شکایت اگر صحیح مان لی جائے کہ یہودی اور عیسائی اخبارات ہمیشہ مسلمانوں کی بری تصویر پیش کرتے ہیں تو عین یہی بات خود مسلم اخبارات بھی عیسائیوں اور یہودیوں کے بارہ میں کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مسلم صحافت سے اگر ہماری مراد مسلم وکالت ہے تو یہ بالکل بے فائدہ ہے۔ اس کے برعکس مسلم صحافت کو بیانِ واقعہ پر مبنی ہونا چاہئے۔ اس طرح ایک طرف ہم اپنے نقائص سے مطلع ہوکر اس کی اصلاح کی طرف توجہ دے سکیں گے۔ دوسری طرف ہمارے اخبار کو قارئین کے درمیان مقبولیت حاصل ہوگی۔ وکیلانہ صحافت کو کبھی عمومی ریڈرشپ نہیں مل سکتی، حتی کہ اس گروہ کے درمیان بھی نہیں جس کی وکالت کے لئے اسے جاری کیا گیا ہے۔

سری لنکا سے ایک صاحب کانفرنس میں شریک ہوئے۔ انھوں نے ان مظالم کی تفصیل بیان کی جو اکتوبر۔ نومبر ۱۹۸۷ میں وہاں کے مسلمانوں کو پیش آئے اور جس کے نتیجے میں تقریباً پچاس ہزار آدمی اپنے وطن کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ انھوں نے جو تفصیلات بیان کیں، ان سے میں نے جو نتیجہ نکالا، وہ یہ تھا کہ سری لنکا کے ایک علاقہ میں تامل باشندوں نے آزاد تامل اسٹیٹ کا مطالبہ کیا۔ اس علاقہ کے ایک مختصر حصہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ان مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ وہ تامل اسٹیٹ کے

اندر کمزور اقلیت بن جائیں گے۔ چنانچہ ان کے لیڈروں نے مطالبہ کیا کہ اس علاقے میں ایک "مسلم پراونشیل کونسل" بنائی جائے جس کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی حاصل ہو۔ اس مقصد کے لئے براہ راست یا بالواسطہ مطالبے اور مظاہرے شروع ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سری لنکا کے مسلمان حکومت اور تامل ٹائیگرس دونوں کی نظر میں مشتبہ ہو گئے۔ اسی سیاست کا نتیجہ ہے کہ جس سے آجکل سری لنکا کے ایک ملین سے زیادہ مسلمان دوچار ہیں۔

سری لنکا اور دوسرے بہت سے ملکوں (مثلاً برما، فلپائن، اریٹیریا وغیرہ) میں آج کل مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ میرے نزدیک "تقسیم" کی سیاست کی توسیع ہے۔ اس طریق کار کی نادرستگی خود اس ملک میں ثابت ہو چکی ہے جو تقسیم کی سیاست کے نتیجہ میں بنا تھا۔ یہ منقسم ملک ۱۹۷۱ میں دو ملک میں تقسیم ہو گیا اور اب وہاں تقسیم کرانے والے لوگ دوبارہ ایک اور تقسیم (مہاجر صوبہ) کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس واضح ناکامی کے باوجود جو لوگ بدستور تقسیم کو اپنے مسئلہ کا حل سمجھیں اور اس کے لئے تحریک چلائیں، ان کے متعلق کم سے کم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ بصیرت سے محروم ہیں۔ ان کو ماضی کا گزرا ہوا واقعہ بھی دکھائی نہیں دیتا، پھر کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ مستقبل کے آنے والے واقعہ کو دیکھ سکتے ہیں۔

"جمہوریت" بظاہر اچھی چیز ہے۔ مگر جمہوریت کی صحیح کارکردگی کے لئے شعوری پختگی اور فکری انضباط نہایت ضروری ہے ورنہ جمہوریت بے فائدہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً اس کانفرنس میں ایک موضوع خواتین کے دعوتی رول (دور المرأة المسلمة في الدعوة الاسلامية) تھا۔ اس موضوع کا آغاز ایک صاحب کی تقریر سے ہوا۔ ان کی تقریر عمومی نوعیت کی تھی۔ چنانچہ فوراً ہی ایک صاحب نے کہا کہ یہ تقریر غیر متعلق ہے۔ کیوں کہ ایجنڈا کے مطابق موضوع "دعوت اسلامی میں مسلم عورت کا رول" ہے اور مقرر نے عمومی طور پر مسئلہ خواتین پر تقریر کی ہے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ "دعوت" کسی محدود چیز کا نام نہیں۔ دعوت سے مراد تمام اسلامی سرگرمیاں ہیں۔ ایک صاحب نے اپنی پرجوش تقریر میں کہا کہ دعوت کا مطلب میرے نزدیک اسلام کا عملی پہلو (Practical aspect of Islam) ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی بحثیں دیر تک ہوتی رہیں اور کوئی متعین اور مثبت چیز سامنے نہ آسکی۔

جمہوری انداز کی ہر میٹنگ یا کانفرنس میں میں نے یہی منظر دیکھا ہے۔ ہمارے لیڈر جو جمہوریت کی حمایت میں پر جوش تقریریں کرتے ہیں، انھیں اس سے پہلے لوگوں کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرنی چاہئے کہ وہ فکری انضباط کے ساتھ سوچنے کے قابل ہو سکیں۔

مدرسہ کی تعلیم کے زمانہ میں میرے ایک ساتھی محمد عبد الرشید برمی تھے۔ وہ رنگون کے رہنے والے تھے۔ اپنے ملک واپس جانے کے بعد انھوں نے "برمی مسلم آرگنائزیشن" کے نام سے ایک جماعت بنائی۔ وہ اس کے صدر تھے۔ یہ تنظیم برما میں بہت مقبول ہوئی۔ وہ ایک اچھے مقرر تھے انھوں نے الکشن میں حصہ لیا۔ پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے اور اس کے بعد "لیبر اینڈ انڈسٹری" محکمہ کے وزیر مقرر ہوئے۔ دوسرے ممالک سے برما کے تعلقات قائم کرنے میں انھوں نے اہم رول ادا کیا اور ملک میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔

مالدیپ کی کانفرنس میں برما کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ عبد الرشید (ایم اے رشید) کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ان سے ان کے بارہ میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۶۲ میں جب برما میں فوجی حکومت قائم ہوئی اور اس نے منتخب حکومت کو ختم کر دیا تو عبد الرشید صاحب کھل کر اس کے خلاف تنقیدیں کرنے لگے :

He used to criticise the government openly

چنانچہ حکومت ان کی مخالف ہو گئی۔ آخر عبد الرشید صاحب پاکستان چلے گئے اور وہیں ۱۹۷۸ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

انھوں نے مزید بتایا کہ عبد الرشید صاحب نے اپنی وزارت کے زمانہ میں علماء کی ایک کمیٹی بنائی تھی۔ اس کمیٹی نے قرآن کا ترجمہ برمی زبان میں کیا۔ تاہم اس کے چھپنے سے پہلے عبد الرشید صاحب کی حکومت ختم ہو گئی۔ بعد کو قرآن کا یہ ترجمہ خود موجودہ حکومت کے تعاون سے شائع ہوا۔ موجودہ حکومت مسلم تنظیموں کو ۶۵۰۰۰ چاٹ (برمی سکہ) سالانہ امداد دیتی ہے۔ اسی سے مذکورہ ترجمہ قرآن شائع کیا گیا ہے۔

میں نے کہا کہ عبد الرشید صاحب نے ختم حکومت کے بعد جو راستہ اختیار کیا، وہ یہ تھا کہ نئی حکومت کے مخالف بن کر کھڑے ہوں اور بالآخر پاکستان جا کر خاموشی کے ساتھ فوت ہو جائیں۔ اس

کے بجائے اگر انھوں نے بدلے ہوئے حالات سے مطابقت کی روش اختیار کی ہوتی تو عین ممکن تھا کہ ان کو نئے حالات میں دوبارہ مواقع کار مل جائیں جس طرح ان کے ترجمہ قرآن کے کام کو نئی حکومت کے زمانہ میں مواقع ملے۔ مذکورہ برمی مسلمان میری یہ بات سُن کر خاموش ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ طرز فکر ان کے لئے بالکل نیا ہے۔

ایک صاحب جنوبی افریقہ سے آئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اچھی انگریزی بولتے ہیں اور کافی معلومات رکھتے ہیں۔ میرے پاس گاڈ ارائزز (God Arises) کا ایک نسخہ تھا۔ میں نے واپسی کی شرط پر ان کو یہ کتاب دیکھنے کے لئے دی۔ اگلے دن انھوں نے بتایا کہ میں کتابیں چوری کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ مگر آپ کی اس کتاب کو دیکھنے کے بعد اس کے بارہ میں میری نیت خراب ہوگئی ہے۔ میں اس کو واپس کرنا نہیں چاہتا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی انگریزی اتنی اچھی ہے کہ میں نے بے شمار کتابیں پڑھی ہیں مگر اب تک کسی دینی شخصیت کی کتاب میں مجھے ایسی انگریزی زبان نہیں ملی۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے کیوں کر ایسی کتاب تیار کی۔ میں نے وہ کتاب ان کے حوالے کر دی۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ علمی ذوق رکھتے ہیں اور کثرت سے مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک اور کتاب انھیں دیدی جو "پرافٹ آف ریولیوشن" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

"بغیر دیکھے میں جانتا ہوں آپ کو آپ کی کتابوں سے" یہ کہتے ہوئے ایک صاحب مجھ سے ملے۔ ان کے صاف اردو لہجہ پر مجھے تعجب ہوا۔ یہ جناب ابراہیم شہاب تھے جو مالدیپ کی اسمبلی میں اسپیکر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے جامعہ ملیہ (دہلی) میں اس وقت تعلیم حاصل کی ہے جب کہ جامعہ قرول باغ میں تھی، پھر انھیں کے زمانے میں وہ اوکھلا منتقل ہوگئی۔

ملاقاتوں کے دوران معلوم ہوا کہ یہاں بہت سے مرد اور عورتیں ہیں جو الرسالہ سے واقف ہیں یا اسلامی مرکز کی اردو یا عربی یا انگریزی کتابیں پڑھی ہیں۔ ایک خاتون جو ایک مقامی اخبار سے منسلک ہیں، انھوں نے بتایا کہ ہم نے الرسالہ کے کئی مضامین دویہی زبان میں ترجمہ کرکے مقامی اخبار میں شائع کئے ہیں۔ (مالدیپ کی مقامی زبان کا نام دویہی ہے)

جناب عبد اللطیف صاحب کا تعلق ایجوکیشن منسٹری سے ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مالدیپ میں بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے آپ کی کتابیں (عربی یا انگریزی) پڑھی ہیں۔ ہم لوگ دینی علمی موضوعات

ہیں آپ ہی کے افکار کا حوالہ دیتے ہیں، کیوں کہ وہ سائنٹفک انداز میں ہوتے ہیں۔ ان کو میں نے الرسالہ انگریزی (نومبر، دسمبر ۱۹۸۷) ایک ایک عدد دیا۔ جناب عبد الحمید عبد الوہاب (ہائیکورٹ) کا خط مجھے دہلی میں ملا تھا، انھوں نے دو کتابوں کی فرمائش کی تھی۔ یہ کتابیں میں اپنے ساتھ لایا تھا اور یہاں ان کے حوالہ کر دیا۔ یہ کتابیں تھیں: خاتون اسلام اور گاڈ ارائزز۔

ایک صاحب کناڈا سے آئے تھے۔ وہ کناڈا ہی میں پیدا ہوئے، ان کی مادری زبان انگلش ہے۔ انھوں نے اعلیٰ مرحلہ تک کناڈا ہی میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کو میں نے انگریزی الرسالہ دیکھنے کے لئے دیا۔ انھوں نے اسی دن سب پڑھ ڈالا۔ انھوں نے خاص طور پر "چھوٹے چھوٹے بامعنی مضامین" کو پسند کیا۔ میں نے الرسالہ کی زبان کے بارہ میں ان کی رائے پوچھی۔ انھوں نے کہا:

> The articles were not written as translations from Urdu or Arabic into English, but as from English to English.
>
> Haroon Salamat, P.O. Box 66
> Station U, Toronto, ONT, Canada M8Z ITO

۷ دسمبر ۱۹۸۷ کی شام کا کھانا ایک اور جزیرہ پر رکھا گیا تھا۔ اس کو یہاں کی زبان میں کورمبا گاؤں (Kurumba village) کہا جاتا ہے۔ کانفرنس کے تمام شرکاء بڑی موٹر بوٹ کے ذریعہ مالے سے کورمبا لے جائے گئے۔ اس جزیرہ پر سیاحوں کے لئے بہت بڑا ہوٹل بنایا گیا ہے۔ اسی ہوٹل میں کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

جزیرہ ملے سے جزیرہ کورمبا تک ۲۰ منٹ کا راستہ ہے۔ اس وقت سمندر میں کسی قدر تموج تھا، اس لئے موٹر بوٹ معمول سے زیادہ ہلنے لگی۔ اس قسم کا تموج مہلک نہیں، تاہم وہ انسان کے عجز کے مقابلہ میں سمندر کی طاقت کا تجربہ کراتا ہے۔ میں نے کہا کہ خدایا، جس طرح آپ اتھاہ سمندر میں غرقابی سے بچاتے ہوئے میرا سفر طے کرا رہے ہیں، اسی طرح معاندین کی سازشوں سے محفوظ رکھ کر اس مشن کو جاری رکھئے، جس کے لئے اٹھنے کی آپ نے اس عاجز اور حقیر بندے کو توفیق عطا فرمائی ہے۔

ایک روز کھانے کی میز پر میرے سامنے نئے حلیہ کے ایک آدمی تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ جاپانی ہیں۔ ان کا نام تنو گوکٹا کورا ہے۔ مالدیپ میں آجکل جاپان کی امداد کے تحت ٹیلیفون لگائے جارہے ہیں، اس میں وہ بطور کنسلٹنٹ یہاں آئے ہیں۔ وہ ٹوکیو کے مضافات میں ۱۷ جنوری ۱۹۳۰ کو

پیدا ہوئے۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے وقت مڈل اسکول کے طالب علم تھے۔

ان سے انگریزی میں گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ جاپانیوں کے بارہ میں مجھے سب سے زیادہ عجیب چیز ان کی تبدیلی کی صلاحیت معلوم ہوتی ہے۔ یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔ دوسری جنگ عظیم تک وہ بالکل جنگ جو قوم تھے۔ دوسری جنگ کے خاتمہ پر اچانک وہ پر امن قوم بن کر تعلیم اور سائنس کے میدان میں سرگرم ہو گئے۔ جاپانیوں نے اس صلاحیت کا سرچشمہ کیا ہے۔

انھوں نے اس کا سبب جاپانی جغرافیہ کو قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ جاپان میں سال میں چار موسم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہمیں بار بار اپنے آپ کو بدلنا پڑتا ہے۔ جاپان میں کثرت سے زلزلے اور طوفان آتے ہیں اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ہر وقت نئی صورت سے مطابقت کرنے کے لئے تیار رہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ بھی ہے کہ جاپانی لوگ نئی باتوں کو جاننے کے لئے بے حد متجسس رہتے ہیں:

Japanese are very curious to know new things, new ideas

جاپانی قوم کی اسی صلاحیت کا نتیجہ تھا کہ جنگ عظیم کی بربادی کے بعد ان کے اندر شدت سے نئی سوچ ابھری۔ انھوں نے سابقہ روش کو ترک کر کے نئے حالات کے مطابق دوسری روش اختیار کر لی۔ میں سوچا کہ یہ فرق بھی کتنا عجیب ہے۔ ایک قوم کے لئے اس کے "زلزلے" ترقی کا زینہ بن جاتے ہیں، اور دوسری قوم کے "زلزلے" اس کو صرف فریاد و ماتم کی غذا دے رہے ہیں۔

مسٹر شوگو کٹاکورا سے دوسری بار ۱۰ دسمبر کو ملاقات ہوئی تو میں نے خدا اور مذہب کے موضوع پر تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے اپنا کارڈ دیا جس میں ان کا حسب ذیل پتہ لکھا ہوا تھا:

Shogo Katakura, 33, Udagawa-Cho, Shibuya-Ku
Tokyo 150, Japan. Phone 81-3-4622221

وہ پیدائشی طور پر بدھسٹ ہیں۔ مگر خدا اور مذہب کے بارہ میں زیادہ یقین نہیں رکھتے۔ زندگی بعد موت کے بارہ میں مشتبہ ہیں۔ میں نے کہا کہ ایک برطانی مصنف نے لکھا ہے کہ جاپان کی جدید نسل کے اندر میٹریلزم سے بے اعتمادی پیدا ہو رہی ہے، وہ کہہ رہے ہیں ہمارا کلچر تو صرف مرچنٹ کلچر ہے، زندگی کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں۔

انھوں نے کہا کہ یہ صحیح ہے۔ انھوں نے بتایا کہ دوسری جنگ کے بعد جاپان میں زندگی بہت

مشکل ہوگئی تھی۔ کھانا اور کپڑا جیسا ضروری سامان بھی بہت کم ملتا تھا۔ چنانچہ جاپانیوں میں شدت سے کمانے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اب موجودہ جاپانی کے پاس سب کچھ بافراط موجود ہے تو اس کو احساس ہو رہا ہے کہ صرف مادی ساز و سامان کافی نہیں۔ چنانچہ جاپان میں ایسے افراد کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے جو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ اور مادیت سے آگے کسی اور چیز کی تلاش کر رہے ہیں۔

جاپان کے لوگوں کو اسلام سے متعارف کیا جائے تو وہاں بہت تیزی سے اسلام پھیل سکتا ہے۔ مگر یہ کام صرف جاپانی زبان میں ممکن ہے کیوں کہ جاپان میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو جاپانی کے سوا کوئی اور زبان بخوبی جانتے ہوں۔

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ موجودہ زمانہ میں جو مسلم رہنما اٹھے، ان کے ساتھ اتنے زیادہ لوگ جمع ہوگئے جو کبھی کسی پیغمبر کے ساتھ بھی جمع نہیں ہوئے تھے، حتی کہ پیغمبر اسلام ؐ کے ساتھ بھی نہیں۔ اس کا سبب کیا ہے۔

میں نے کہا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ پیغمبر کی دعوت ہمیشہ داخلی رخی ہوتی ہے اور موجودہ زمانہ کے رہنماؤں کی دعوت خارج رخی تھی۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دونوں کے پیروؤں کی تعداد میں اتنا زیادہ فرق پیدا کر دیا۔ اگر آپ ایسی تحریک اٹھائیں جس کی زد آدمی کی اپنی ذات پر پڑتی ہو، جو خود اپنے اندر تبدیلی کا تقاضا کرتی ہو تو آپ کو بہت کم ساتھ دینے والے ملیں گے۔ کیوں کہ احتساب خویش انسان کے لئے سب سے زیادہ مشکل چیز ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ ایسی تحریک اٹھائیں جس کی زد دوسروں کے اوپر پڑتی ہو، جس میں دوسروں کے خلاف جھنڈا اٹھانے کا موقع ملتا ہو تو آپ کے ساتھ بھیڑ کی بھیڑ جمع ہو جائے گی۔ کیوں کہ احتساب غیر انسان کی محبوب ترین چیز ہے۔

دکتور حسن القوتلی (پیدائش ۱۹۳۱) لبنان سے آئے تھے۔ کھانے کی میز پر ایک بار ان کا ساتھ ہوگیا۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ہمارے ساتھیوں کے درمیان ایک مسئلہ پر کئی دن تک بحث ہوتی رہی۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ قرآن خدا کا مکمل کلام ہے یا جزئی کلام۔ اس سوال کی بنیاد یہ تھی کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر تمام سمندر سیاہی بنا دئے جائیں اور خدا کے کلمات لکھے جائیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے، مگر خدا کے کلمات ختم نہ ہوں گے (الکہف ۱۰۹) گویا خدا کے کلمات غیر محدود ہیں جبکہ

قرآن محدود کتاب ہے۔ اسی طرح قرآن میں ہے کہ ادعونی استجب لکم (البقرہ ۱۸۶)
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کا کلام جاری ہے، وہ ختم نہیں ہوا۔

میں نے پوچھا کہ پھر آپ لوگوں نے کس رائے پر اتفاق کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے اس پر اتفاق کیا کہ: اِنّ کلام اللہ فی القرآن ھو کلام اللہ بالمجمل، اَما کلامہ بالتفصیل فھو موجود فی الکون (قرآن میں اللہ کا کلام مجمل ہے، اس کا تفصیلی کلام کائنات میں موجود ہے)

اسی نشست میں ان سے لبنان کے حالات پر گفتگو ہوئی تو وہ فوراً لبنانی عیسائیوں کی شکایت کرنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ عیسائی ہم پر مسلسل ظلم کر رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو ہر قسم کا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ قرآن کے بارہ میں ایک غیر متعلق بحث میں آپ اور آپ کے ساتھیوں نے کئی دن صرف کر دئے۔ مگر عیسائی مسئلہ کا جواب آپ نے قرآن میں تلاش نہیں کیا۔ حالانکہ وہ براہ راست آپ سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر میں نے آیات اور احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے، یہاں ہر آدمی کو آزادی حاصل ہے۔ اس بنا پر یہاں ہر ایک اپنے امکان کے بقدر استغلال میں لگا رہتا ہے۔ لبنان کے عیسائی علم اور ثقافت کے میدان میں مسلمانوں سے آگے بڑھے ہوئے ہیں، یہی وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا استغلال کر رہے ہیں۔ اس کا حل شکایت اور فریاد نہیں۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو ترقی کے راستوں میں آگے بڑھایا جائے۔ اس کے بعد یہ مسئلہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

۱۰ دسمبر کی شام کو مالدیپ کے صدر مامون عبد القیوم سے اجتماعی ملاقات ہوئی۔ وہ عربی اور انگریزی دونوں زبانیں روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔ وہ مطالعہ کا ذوق رکھتے ہیں اور انھوں نے میری عربی کتابیں قاہرہ میں تعلیم کے زمانہ میں پڑھی ہیں۔ مالدیپ کے وزیروں اور اعلیٰ عہدیداروں میں اکثر لوگ انگریزی کے ساتھ عربی زبان بھی بخوبی جانتے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا: "مالدیپ موجودہ زمانہ میں واحد مسلم ملک ہے جہاں مولویوں کی حکومت ہے"۔ میں نے کہا کہ آپ کی بات صرف جزئی طور پر صحیح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کا ہر مسلم حکمراں خواہ وہ بظاہر بے ریش ہو، اندر سے وہ "مولوی" ہی تھا۔ مگر مسلم قائدین

کی جھوٹی مخالفانہ سیاست نے ہر مولوی حکمراں کو مسٹر حکمراں بنا دیا۔

استاذ محمود احمد کفتارو (۴۰ سال) دمشق سے آئے تھے۔ وہ وہاں مفید دینی کام کر رہے ہیں۔ دوسرے بہت سے مسلم نوجوانوں کی طرح ان کا انجام بھی یہ ہو سکتا تھا کہ جہاد کے نام پر حکمرانوں سے بے معنی جنگ کریں اور پھر ناکام ہو کر دنیا کو یہ خبر دیں کہ یہ حکمراں اسلام اور اسلامی تحریکوں کے دشمن ہیں۔ مگر ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو ایسا باپ ملا جو واقعی معنوں میں حکیم تھا۔ اس نے ان کو صحیح ترین مشورہ دیا۔ اور سعادت مند بیٹے نے اس مشورہ کو قبول کر لیا۔

دکتور الشیخ احمد کفتارو (المفتی العام للسوریة، رئیس المجلس الافتاء الاعلیٰ) نے اپنے لائق بیٹے کو بتایا کہ کوئی حقیقی کام کرنے کے لئے لازمی طور پر حکمت درکار ہوتی ہے۔ حکمت کے بغیر نہ دین کا کوئی کام کیا جا سکتا اور نہ دنیا کا۔ حکمت کیا ہے، حکمت یہ ہے کہ مطلوب کام مطلوب وقت پر اور مطلوب شکل میں کیا جائے (الحکمة : فعل ماینبغی، فی الوقت الذی ینبغی، وعلی الشکل الذی ینبغی)

شیخ کفتارو کا کہنا ہے کہ موجودہ حالات میں ہمارے لئے لازم ہے کہ ہمارا بنیادی کام دعوت کے میدان میں ہو۔ ہم سیاسی لوگوں سے جھگڑا نہ کریں تاکہ دعوت اسلامی کے مواقع ضائع نہ ہو جائیں (یجب ان یکون عملنا الاساسی فی میدان الدعوة و لا نتناحر مع السیاسیین حتی لاتضیع علی الدعوة الاسلامیة الفرض)

شیخ کفتارو کے صاحبزادہ محمود احمد کفتارو کی زبان سے میں نے یہ باتیں سنیں تو میں نے کہا کہ بلاشبہ یہی حکیمانہ طریقہ ہے اور اسی کا نام اسلام ہے۔ اس کے سوا جو کچھ آج اسلام کے نام پر کیا جا رہا ہے وہ محض بے معنی لیڈری ہے جس کی کوئی قیمت نہ دین کے اعتبار سے ہے اور نہ دنیا کے اعتبار سے۔

ایک صاحب نے اپنی پرجوش تقریر میں کہا کہ غیر مسلم تنظیموں اور غیر مسلم حکومتوں میں ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ سب کے سب اسلام کے دشمن ہیں۔

All are enemies of Islam

میں نے کہا کہ آپ کا فرمانا ہے کہ سب اسلام دشمن ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ سب اسلام دوست

ہیں۔ آپ کی مشکل یہ ہے کہ آپ معاملہ کو اس کے ظاہری پہلو (Face value) پر دیکھ رہے ہیں۔ اور میں معاملہ کو اس کی حقیقت کے اعتبار سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ وہی فرق ہے جو خود پیغمبر ؐ کے زمانہ میں بھی موجود تھا۔ اس وقت عرب کے بیشتر لوگ پیغمبر کے سخت ترین مخالف بنے ہوئے تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کے سب اسلام کے دشمن ہیں۔ مگر بعد کو لوگوں نے دیکھا کہ حالات بدلے اور انھیں لوگوں نے اسلام کی صف میں شامل ہو کر اسلام کی تاریخ بنائی۔ یہ سب کچھ آج بھی ممکن ہے، بشرطیکہ ہم پیغمبر اسلام والے طریقہ پر چلنے کے لئے تیار ہوں۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بڑے جوش سے کہا: میں قرآن کو مانتا ہوں مگر میں حدیث کو نہیں مانتا۔ میں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے کہا کہ حدیث میں ایسی ایسی باتیں ہیں جو سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں نے کہا کوئی مثال دیجئے۔ انھوں نے مثال میں وہ حدیث پیش کی جس میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے کہا کہ جاؤ لوگوں کو خوش خبری دے دو کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دے وہ جنت میں جائے گا۔ حضرت عمر راستہ میں مل گئے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت ابو ہریرہ اس طرح کہہ رہے ہیں تو ان کو پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے اور کہا کہ ایسا مت کیجئے۔ ورنہ لوگ اسی پر بھروسہ کر لیں گے (اذاً یتکلوا) آپ نے حضرت عمر کی رائے سے اتفاق کر لیا۔

میں نے کہا کہ یہ حدیث انتہائی بامعنی ہے۔ اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات فرمائی تھی وہ باعتبار حقیقت تھی۔ مگر حضرت عمر کو اندیشہ ہوا کہ لوگ اس کو باعتبار الفاظ لے لیں گے اور محض تلفظ کلمہ کو جنت کا زینہ سمجھنے لگیں گے۔ حالانکہ اصل چیز حقیقتِ کلمہ ہے نہ کہ تلفظِ کلمہ۔ یہ عین وہی بات ہے جو خود قرآن میں ساتویں پارہ کے شروع میں بیان ہوئی ہے۔

۱۰ دسمبر کو دن کا کھانا حکومت مالدیپ کی طرف سے جزیرہ بانڈوس (Bandos) پر تھا۔ دو موٹر بوٹ کے ذریعہ کانفرنس کے شرکاء جزیرہ پر پہنچائے گئے۔ یہ سفر دن میں ہوا۔ اس لئے جسمانی سفر کے ساتھ روحانی سفر کی منازل بھی خدا کی توفیق سے طے ہوتی رہیں۔

مالدیپ کی اقتصادیات کا انحصار، مچھلی کے بعد "ٹورسٹ انڈسٹری" پر ہے۔ اس لئے یہاں کی ہر چیز سیاحت رخی انداز میں بنائی گئی ہے۔ بانڈوس جزیرہ پر بھی سیاحوں کے ذوق کے

مطابق ایک ہوٹل بنایا گیا ہے۔ اسی ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔

کھانے سے فراغت کے بعد سمندر کے کنارے میں ایک "چھتری" کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ میرے سامنے ساحل تھا اور ساحل پر مغربی مرد اور عورتیں نیم برہنہ حالت میں تفریح میں مشغول تھے۔ میں نے سوچا کہ مغربی تقسیم کے مطابق سامان حیات کے تین درجے ہیں: ضرورت، راحت، تعیش۔ جدید انقلاب نے مغربی انسان کو موقع دیا کہ وہ ایک کے بعد ایک ان تینوں مراحل سے گزر سکے۔ مگر تعیش کے اعلیٰ مرحلہ پر پہنچنے کے بعد بھی اس کو تسکین نہیں ملی۔ چنانچہ اب مغربی انسان اباحیت کا تجربہ کر رہا ہے۔ یہ اس کی زندگی کا آخری مرحلہ ہے، اس کے بعد کوئی اور مرحلہ نہیں۔ اس کے بعد جو مرحلہ ہے وہ صرف مایوسی کا مرحلہ ہے۔ مغربی زندگی میں اس مرحلہ کا آغاز ہو چکا ہے اور وہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اس طرح اب وہ آخری وقت آگیا ہے جب کہ انسان کو خدا کے سچے دین کا پیغام پہنچایا جائے اور وہ اس کو اپنے اندرونی اضطراب کا جواب پا کر اسے قبول کر لے۔

۱۱ دسمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز اسلامک سنٹر کی مسجد میں ادا کی۔ یہ سنٹر غالباً مالدیپ کی سب سے زیادہ شاندار عمارت ہے۔ کم از کم صدر مالدیپ کی قیام گاہ سے یقینی طور پر زیادہ شاندار۔ نماز سے فراغت کے بعد جب باہر آئے تو امام کے خطبہ کی فوٹو کاپیاں لوگوں کو تقسیم کی جا رہی تھیں۔ امام اپنا خطبہ عربی اور مالدیبی میں پہلے سے لکھ لیتا ہے۔ اس کے بعد اس کی فوٹو کاپی تیار کر لی جاتی ہے اور اس کو نماز کے بعد تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایسا ہر جمعہ کو کیا جاتا ہے۔

پہلے دن جب میں مالدیپ میں داخل ہوا تو یہاں کی دنیا مجھ کو بہت پرکشش معلوم ہوئی تھی۔ اتھاہ سمندر کے درمیان جگہ جگہ ابھری ہوئی خشکی اور اس کے اوپر ہرے بھرے درخت، سمندر میں ہر طرف دوڑتی ہوئی کشتیاں، چاروں طرف کھلی ہوئی فضا اور کھلا آسمان، اس طرح کے مختلف مناظر جو یہاں افراط کے ساتھ موجود ہیں وہ کچھ دیر کے لئے آدمی کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ مگر چند ہی دن کے بعد وہ کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے جس کو آجکل کی زبان میں بورڈم Boredom کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۲ دسمبر ۱۹۸۷ کو جب میں مالدیپ سے روانہ ہوا تو تمام ابتدائی کشش ختم ہو چکی تھی۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے لامحدود دنیا چاہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ موجودہ محدود دنیا اس کے لئے مستقل خوشی کا سبب نہیں بنتی۔ ابدی مسرت صرف ان انسانوں کے لئے

مقدر ہے جن کو اللہ اپنی رحمتِ خاص سے آخرت کی ابدی جنتوں میں داخل کردے۔

اس سفر کا ایک عجیب واقعہ وہ ہے جو واپسی میں تریوندرم انٹرنیشنل ایرپورٹ پر گزرا۔ دہلی کا جہاز لینے کے لئے دوبارہ مجھے یہاں اترنا تھا۔ امیگریشن سے فارغ ہو کر اندر داخل ہوا تو کسٹم کاؤنٹر سامنے تھا جہاں لوگوں کے بکس اور بنڈل کھول کھول کر دیکھے جا رہے تھے۔ چونکہ میرے پاس کوئی کسٹم والی چیز نہیں تھی، میں نے چاہا کہ میں سیدھا گیٹ پر چلا جاؤں۔ مگر پولیس کے آدمی نے مجھے روک دیا اور کہا کہ پیچھے جاکر لائن میں کھڑے ہو جائیے۔ یہ بڑا سخت مرحلہ تھا۔ کیوں کہ میں سب سے پیچھے تھا اور لمبی لائن میں مجھے گھنٹوں تک کھڑا رہ کر انتظار کرنا پڑتا۔ اتنے میں کسٹم کے ایک آدمی نے شاید میرا "مولویانہ" حلیہ دیکھ کر خود ہی مجھ کو بلایا۔ اس نے پوچھا کہاں سے آرہے ہیں۔ میں نے کہا کہ مالدیپ سے۔ کس لئے گئے تھے۔ میں نے دوبارہ کہا اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لئے۔ اس نے چک کئے بغیر کہا کہ جائیے۔

دوسرا شدید تر مرحلہ یہ تھا کہ میری دہلی کی فلائٹ اگلے دن تھی۔ چنانچہ مجھے تقریباً ۲۴ گھنٹے تریوندرم میں رکنا تھا۔ راستہ میں میں نے بعض مسافروں سے پوچھا کہ کیا یہاں انڈین ایرلائنز کی طرف سے ٹرانزٹ پسنجر کو ٹھہرانے کا انتظام ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں باہر نکل کر لاونج میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ رات کے وقت اس نامعلوم جگہ پر کہاں جاؤں۔ اتنے میں ایک تیلون پوش ادھیڑ عمر کے آدمی آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ایک ٹرانزٹ پسنجر ہوں..... ابھی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے کہا: اپنا بیگ اٹھالیجئے اور میرے ساتھ آئے۔ وہ مجھ کو ایرپورٹ کے ایک افسر کے پاس لے گئے اور اس کو میرا معاملہ بتایا:

K.V. Thimothy, Station Duty Officer
Air Customs, International Airport, Trivandrum.

مذکورہ افسر نے کہا کہ یہ میری ڈیوٹی تو نہیں ہے۔ مگر میں ہوٹل لوسیا کانٹی نینٹل (Luciya) (Continental) کو ٹیلی فون کر کے پتہ کرتا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے فوراً ہی ہوٹل کے نمبر سے ٹیلی فون پہ بات کی اور پھر مجھ سے کہا کہ آپ وہاں چلے جائیں۔ آپ کا کمرہ، کھانا، ٹیکسی کا کرایہ سب انڈین ایرلائنز کے ذمہ ہوگا۔ مزید انھوں نے پولیس کے ایک آدمی کو میرے ساتھ کر دیا اور اس سے کہا کہ

ان کو لے جاکر ٹیکسی پر بٹھاؤ اور ٹیکسی کا نمبر نوٹ کر لو۔ اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ مذکورہ افسر نے نہ میرا پاسپورٹ مانگا اور نہ میرا ٹکٹ دیکھا۔ اس نے صرف میرے زبانی بیان پر اعتماد کرتے ہوئے یہ پوری کارروائی کی۔

میں نے سوچا کہ جس ملک میں اتنے شریف انسان بستے ہوں، وہاں چند استثنائی واقعات کو لے کر سارے ملک میں ہندو مسلم مسئلہ کھڑا کرنا کتنا بڑا جرم ہے۔ اور افسوس کہ اس ملک کی مسلم قیادت اسی مجرمانہ کام میں پچھلے پچاس برس سے مبتلا ہے۔ اس کو نہ قرآن کی آیتیں اس بے معنی کام سے روکنے والی ثابت ہو رہی ہیں اور نہ مسلمانوں کے حق میں اس پالیسی کے اندوہناک نتائج۔

ہوٹل لوبیا کانٹی ننٹل کا کمرہ نمبر ۲۱۶ ہے۔ میں رات کے وقت سویا ہوا ہوں۔ نیند کھلتی ہے تو میں وقت جاننا چاہتا ہوں۔ اپنی گھڑی کے بارہ میں مجھے کچھ شبہ ہوتا ہے۔ میں ٹیلیفون کا ریسیور اٹھاتا ہوں۔ اس کے بعد میرے اور ریسپشن کے آدمی کے درمیان مختصر گفت گو ہوتی ہے جو حسب ذیل ہے:

Good Morning, Sir
Good Morning, Time please.
Three, thirty
Thank you

یہ ایک سادہ سی بات ہے جو ہر ایک کے ساتھ پیش آتی ہے۔ مگر جب ۱۳ دسمبر کی رات کو اس اجنبی جگہ پر میرے ساتھ یہ واقعہ گزرا تو اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کہ وہ اس آیت کی عملی تفسیر ہو: واذا سألك عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی لعلهم یرشدون (البقرۃ ۱۸۶) اس دنیا کے محسوس واقعات غیر محسوس حقیقتوں کی کہانی بیان کر رہے ہیں۔ مگر اس کو وہی شخص جان سکتا ہے جو اس پر کان لگائے اور خالی الذہن ہو کر اس کو سننے کے لئے تیار ہو۔

لوبیا ہوٹل میں گیڈینس (Gideons) کی بائبل رکھی ہوئی تھی۔ یہ بائبل تمام دنیا کے ہوٹلوں میں مفت رکھی جاتی ہے۔ بائبل کے اس نسخہ میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی چھپا ہوا تھا کہ اگر آپ اس علاقہ میں گیڈینس سے ربط قائم کرنا چاہتے ہیں تو براہ کرم مقامی ٹیلیفون ڈائرکٹری سے معلوم کیجئے:

If you desire to contact Gideons in this area,
please consult the local telephone directory.

موجودہ زمانہ میں بے شمار نئے امکانات پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے شہروں میں جدید طرز کے ہوٹل بنے ہوئے ہیں جن میں بے شمار انسانی قافلے ٹھہرتے ہیں۔ ہر جگہ ٹیلی فون کا نظام قائم ہے اور ڈائرکٹریاں چھپی ہوئی موجود ہیں۔ ان ذرائع نے کسی فکر کی اشاعت کا زبردست نیا امکان پیدا کر دیا تھا۔ مگر ہمارے رہنماؤں نے بے معنی لڑائیوں میں پورا ایک دور ضائع کر دیا۔ جدید ذرائع میں سے کسی ذریعہ کو بھی وہ دین خداوندی کی اشاعت کے لئے استعمال نہ کر سکے۔

بائبل کے اس نسخہ کے شروع میں درج تھا کہ بائبل (John 3:16) میں ایک جملہ ہے جس کو گیارہ سو سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ مذکورہ نسخہ میں چند درجن زبانوں کے ترجمے نقل کئے گئے تھے۔ اس کا عربی ترجمہ ان الفاظ میں درج کیا گیا تھا:

لانہ ھٰکذا احب اللہ العالم حتی بذل ابنہ الوحید
لکی لا یھلک کل من یؤمن بہ بل تکون لہ الحیوۃ الابدیۃ

ابنیت مسیح کا یہ عقیدہ چرچ کے مطابق، مسیحی مذہب کا اہم ترین عقیدہ ہے۔ بلکہ اسی عقیدہ پر موجودہ مسیحیت قائم ہے۔ مگر چرچ کے نزدیک وہ جتنا اہم ہے، عام انسان کو وہ اتنا ہی زیادہ غیر اہم معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ایک مظاہرہ خود بائبل کے اس نسخہ میں موجود تھا جو لوسیا ہوٹل میں رکھا ہوا تھا۔ اس کو میں نے الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس کے آخری صفحہ پر ایک جملہ درج تھا۔ یہ کسی مسافر کا تاثر تھا جو اس نے "مقدس کتاب" کے آخر میں ثبت کیا تھا۔ اگرچہ وہاں مسافر کا نام نہیں تھا۔ تاہم اس کا فقرہ بہت با معنی تھا۔ اس نے اپنے قلم سے لکھا تھا:

Man is only a personality. Nothing beyond that.

یعنی آدمی صرف ایک شخصیت ہے، اس کے آگے اور کچھ نہیں۔ موجودہ مسیحی مذہب کی بنیاد الوہیت مسیح کے عقیدہ پر قائم ہے مگر انسان کی عقل میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ ایک شخص جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا وہ خدا یا خدا کا بیٹا تھا ——— اگر آپ مسیحیت کو مانیں تو آپ کو عقل سے دست بردار ہونا پڑتا ہے اور اگر عقل کو مانیں تو مسیحیت سے۔

تریوندرم سے واپسی میں ایئرپورٹ پر اٹلی کے ایک سیاح سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا نام استفانو گرافینی (Stefano Garaffini) بتایا۔ وہ اٹلی کے شہر فرنز (Firenze) کے رہنے والے ہیں۔ چھٹی میں اپنی بیوی کے ساتھ سیاحت کے لئے نکلے ہیں۔ ابتدائی تعارف کے بعد میں ان سے اس طرح کے سوالات کرتا رہا: کیا آپ خدا کو مانتے ہیں، کیا آپ مذہب میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان سے گفتگو کے بعد خیال آیا کہ ہمارے پاس ایک چھپا ہوا دو ورقہ ہونا چاہئے۔ جو اس طرح کے لوگوں کو فوری مطالعہ کے لئے دیا جا سکے۔ اس میں مختصر اور واضح انداز میں اسلام کا تعارف کیا گیا ہو۔ ان شاء اللہ مرکز کی طرف سے اس قسم کا دو ورقہ چھاپنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۳ دسمبر کو تریوندرم ایئرپورٹ پر تین ہندو نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ ان کے "لیڈر" سنجیو بھارگوا تھے جو نئی دہلی میں انڈین ایئر لائنز کالونی میں رہتے ہیں۔ ان سے بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ یہ لوگ مکمل طور پر ہندوؤں کی نئی نسل کے نمائندہ تھے۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ میرے نزدیک یہ تھا کہ ہندو نوجوانوں کا بگاڑ محض وقتی ہے نہ کہ دائمی اور ابدی۔ سنجیو بھارگوا نے کہا کہ ایک سادہ مثال لیجئے۔ ایک شخص بس میں سفر کر رہا ہے۔ اس کے پاس ایک روپیہ کا پھٹا ہوا نوٹ ہے۔ اگر وہ اس نوٹ کو فولڈ کر کے بس کنڈکٹر کو دے تو وہ اس کو لے لے گا۔ اور اگر وہ اسی نوٹ کو دکھا کر دے تو کنڈکٹر کبھی بھی نہیں لے گا اور اس کو بس سے اتار دے گا۔ یہ تجربات ہیں جو جدید نسل کو بگاڑ رہے ہیں۔

سنجیو بھارگوا نے کہا کہ میری ایج کے ہر آدمی کا نیچر یہ ہوتا ہے کہ وہ غلط کو غلط سمجھتا ہے اور اس سے لڑنا چاہتا ہے۔ مگر جیسے جیسے اس کا تجربہ بڑھتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ غلط کو غلط بتانے میں وہ خود غلط ہو رہا ہے تو اب اس میں ایک تبدیلی آنا شروع ہوتی ہے۔ نیچر کی سطح پر درست ہونے کے باوجود اوپر کی سطح پر وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ ان کی تقسیم کے مطابق، جدید بھارتی نوجوان کے تین دور ہیں ——— نیچر، فرسٹریشن، چینج۔

جدید ہندستانی نوجوان کی جارحیت جس کے خلاف ہمارے لیڈر فریاد کرتے رہتے ہیں، وہ محض اوپری بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ اپنے اندر سب بھی وہ وہی فطرت لئے ہوتے ہے جو خدا نے ہر ایک کے اندر پیدا کی ہے۔ اگر ہم حکمت اور اخلاق کے ذریعہ اس کی اندرونی فطرت کو جگا سکیں تو یہاں بھی وہی واقعہ

ظہور میں آئے گا جس کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے ...... فاذا الذی بینك وبینه عداوة كأنه ولي حميم (حم السجدہ ۳۴)

واپسی کے بعد کانفرنس کے شرکاء میں سے ایک صاحب سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ یہ ڈاکٹر عبدالحکیم طبیبی ہیں۔ وہ افغانی ہیں اور آجکل سوئزرلینڈ میں رہتے ہیں۔ وہ سید جمال الدین افغانی سے بہت متاثر ہیں اور ان کے تاریخی ماہنامہ العروۃ الوثقیٰ کو اسی نام سے عربی اور انگریزی میں جنیوا سے نکال رہے ہیں۔

کانفرنس کے بعد وہ ایک ضرورت کے تحت دہلی آئے اور ہمارے مرکز اور ہمارے کام کو بھی یہاں آکر دیکھا۔ انھوں نے کہا کہ آپ یہاں جو کام کر رہے ہیں وہ اتنا اہم ہے کہ اس کے مقابلہ میں کسی "انٹرنیشنل کانفرنس" میں شرکت کی کوئی اہمیت نہیں۔

میں نے کہا کہ مجھے اس قسم کی کانفرنسوں میں شرکت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بعض اوقات وہ مجھے اوقات کا کمتر مصرف معلوم ہوتی ہیں۔ تاہم ایک فائدہ ہے جس کی وجہ سے میں ان کانفرنسوں میں جاتا ہوں۔ اور وہ تجربہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے ممالک کا سفر اور بین اقوامی کانفرنسوں میں شرکت سے جو تجربات حاصل ہوتے ہیں وہ دفتر میں یا لائبریری میں بیٹھ کر حاصل نہیں کئے جاسکتے۔

یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر میں بیرونی ممالک کا سفر کرتا ہوں۔ میرے یہ تجربات "سفرنامہ" کی صورت میں الرسالہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مگر وہ اردو زبان میں ہوتے ہیں، اس لئے آپ جیسے لوگ ان کو پڑھ نہیں سکتے۔ تاہم اب انگریزی الرسالہ میں بھی سفرناموں کا خلاصہ شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔

جلد دوم تیار

تذکیر القرآن

جلد اول : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ
جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

RN 28822/76 D(SE) 243 March 1988 No. 136

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
″ ″ جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	30/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	4/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	35/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

Rs. 4